ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور
۱۳/ مئی ۹۶ء

☆ ''خلیفہ'' اور ''پوپ'' میں زمین آسمان کا فرق ہے (گوشہ خلافت)

☆ حسنی مبارک سزائیں دینے میں زیادہ ہی ''فراخ دل'' ہیں (عالم اسلام)

☆ عورتوں کی حکمرانی نے ملک کا خانہ خراب کردیا (مکتوب ڈھاکہ)

حدیث امروز

یوم اقبال

جنرل (ر) محمد حسین انصاری

پاکستان میں حضرت علامہ اقبال کا یوم وفات اور یوم ولادت ہر سال ۲۱/ اپریل اور ۹/ نومبر کو منایا جاتا ہے۔ امسال ۲۱/ اپریل کو یہ تقریب الحمرا ہال میں منعقد ہونا تھی جس کے لئے تحریری اجازت نامہ الحمرا آرٹس کونسل کی جانب سے ۱۷/ اپریل کو موصول ہو چکا تھا۔ یوم اقبال کی تقاریب مرکزیہ مجلس اقبال کے زیر اہتمام منعقد ہوتی ہیں۔ اس مجلس کے ایک رکن جناب شہباز شریف بھی ہیں جو قائد حزب اختلاف جناب میاں محمد نواز شریف کے بھائی اور پنجاب اسمبلی میں قائد حزب اختلاف ہونے کے علاوہ مرکزیہ مجلس اقبال کی رکنیت کے ناطے فکر اقبال کے داعی بھی ہوں گے۔ ۵ ماہ ۱۰ دن قید میں گزارنے کے بعد لاہور ہائی کورٹ نے ۱۵/ اپریل ۱۹۹۶ء کو ان کی ضمانت پر رہائی کا حکم جاری کر دیا اور ۱۷/ اپریل کو راولپنڈی سے لاہور پہنچے تو ان کا شاندار استقبال ہوا۔ یوم اقبال کی تقریب کے بارے میں پہلا اشتہار نوائے وقت میں ۱۸/ اپریل ۱۹۹۶ء کو شائع ہوا جس کے مطابق کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر عبدالوہاب کی زیر صدارت یہ تقریب منعقد ہونا تھی۔ یہی اشتہار ۱۹/ اپریل کو بھی نوائے وقت میں شائع ہوا مگر اس بار بھی جناب شہباز شریف کا نام مہمانان یا مقررین میں شامل نہ تھا' البتہ ۲۰ اپریل کو شائع ہونے والے اشتہار میں جناب شہباز شریف کا نام بطور مہمان خصوصی درج تھا۔ اسی روز شام کو الحمرا آرٹس کونسل نے جو سرکاری ادارہ ہے یوم اقبال کے جلسہ کی اجازت اچانک منسوخ کر دی۔ عذر یہ تھا کہ ہال میں بجلی کے نظام میں خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ بھانپتے ہوئے کہ ہال کی بکنگ انہی کی اعلان کردہ شمولیت کی بنا پر منسوخ کی گئی ہو گی جناب شہباز شریف نے ازخود اپنا نام واپس لے لیا اور یوں یوم اقبال کی تقریب ۲۶/ اپریل کو الحمرا ہال میں جناب جسٹس ڈاکٹر نسیم حسن شاہ کی زیر صدارت منعقد ہوئی۔

علامہ اقبال کی تعلیمات کی روشنی میں تمام مقررین نے اپنے اپنے منفرد انداز میں جاگیرداری و سرمایہ پرستی کے نظام کی شدید مذمت کی اور انہیں معاشرے میں پائی جانے والی قباحتوں کی جڑ قرار دیتے ہوئے ختم کر دینے پر زور دیا۔ اصولی طور پر یہ بات درست ہے مگر سوال پیدا ہوتا ہے کہ عملی طور پر اس نظام سے کیسے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ علامہ اقبال کے افکار اب کوئی نئی یافت نہیں۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد لگ بھگ ۱۰۰ مرتبہ یوم اقبال کے نام پر ایسی تقریبات منعقد ہو چکی ہوں گی اور ہر بار تعلیمات اقبال کی روشنی میں اکابرین و رہنمایان قوم نے علامہ کے دکھائے ہوئے راستے پر چلنے کا عزم کیا ہو گا۔ لیکن اس جناب کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔ جاگیرداری اب نظام کے طور پر تو باقی نہیں' البتہ اس نظام بد کی باقیات روز بروز ملک کی بدنصیبی کا باعث بنتی چلی جا رہی ہیں۔ جاگیرداری اس وقت انداز کے طور پر' سوچ کے اعتبار سے' قوت کی شکل میں زندگی کے ہر شعبے میں نمایاں ہے۔ مسجد ہو کہ درسگاہ' نوکر شاہی ہو کہ سیاسی میدان' دولت کا نشہ ہو کہ اختیار کا خمار' ہر ایک اپنی جاگیر پہ قابض دوسرے کا استحصال کر رہا ہے۔ ان سے بے زبان عوام کی جان کوئی کیسے چھڑائے گا۔ ٹوٹی ہوئی بائیسکل سے حویلیوں تک پرواز کرنے والے یا روزینہ اجرت سے آغاز کرتے ہوئے بے شمار صنعتوں کے مالک بننے والے' ملکی بینکوں کا سرمایہ قرضوں کی شکل میں چاٹ جانے والے یا بیرون ملک ڈھیروں جمع رکھنے والے' کروڑوں کے بل بوتے ووٹ خرید لینے والے یا خیرہ سر دھاندلی کے ذریعے ابھر آنے کے ماہر؟ یہی تو انتخابی سیاست پر پنجے گاڑے دانشوروں کی باتوں پہ زیر لب مسکراتے رہتے ہیں۔ اسی لئے امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا کہ یوم اقبال کی تقریبات کو سیاسی اکھاڑا نہ بنائیے' ہمیں اس سے کیا غرض کہ گاؤ آمد و خر رفت یا خر آمد و گاؤ رفت۔ انہوں نے اپنی تقریر کا آغاز قرآن مجید کی سورۃ الفتح کی آیت نمبر ۸ کی تلاوت سے کرتے ہوئے علامہ محمد اقبال کو مبشر پاکستان کا لقب دیا اور واضح کیا کہ علامہ اسلام کے حقیقی تصورات و تعلیمات کو عام کرنے کے خواہاں تھے اور ان کا عملی نفاذ اسلامی انقلاب کے بغیر ممکن نہیں جس کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ تاہم انہوں نے

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

قیمت : ۸ روپے

الھدیٰ

ترجمانی : حافظ عاکف سعید

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

کیاانسان یہ خیال کرتا ہے کہ اسے یونہی بے مہار چھوڑ دیا جائے گاO

(وہ پیکر خاکی جس کے لئے کائنات کی وسیع و عریض بساط بچھائی گئی اور جسے اس سلسلہ تخلیق کا نقطہ عروج قرار دینا غلط نہ ہو گا' کیا اسے شتر بے مہار کی مانند آزاد چھوڑ دیا جائے گا کہ جو چاہے کرتا پھرے اور کوئی اسے پوچھنے والا نہ ہو! نہیں' پوچھ گچھ اور محاسبہ کا ایک دن آکر رہے گا اور انسان کو اس کے اعمال کا بھرپور بدلہ جزا یا سزا کی صورت میں مل کر رہے گا)

کیا وہ ایک حقیر پانی کی بوند نہ تھا جو ٹپکائی جاتی ہےO پھر وہ ایک لوتھڑا بنا' پھر اللہ نے اس کا جسم بنایا' پھر نوک پلک سنواریO پھر اسی سے اس نے زوجین بنائے یعنی نر اور مادہO

(کہ یہ انسان جو آج بڑی ڈھٹائی سے آخرت کا انکار کرتا اور اللہ کی خلاقیت کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے' کیا وہ اپنی خلقت پر غور نہیں کرتا کہ اللہ نے اسے کس پستی سے اٹھا کر اپنی خلاقیت کے طفیل کہاں پہنچایا! ایک گندے پانی کی بوند کو رحم مادر میں اللہ تعالیٰ کن کن مراحل سے گزارتا ہے' اسی نطفے سے مرد بھی وجود میں آتے ہیں اور عورتیں بھی' یہی نقطہ آغاز ہے بڑے سے بڑے حکیم اور فلسفی کا بھی اور یہی بنیاد تخلیق ہے بڑے سے بڑے سیاست دانوں اور مدبروں کی بھی)

کیا وہ اللہ اس پر قادر نہیں کہ مردوں کو پھر سے زندہ کر دے؟O

(جس کی قدرت اور خلاقیت کے مذکورہ بالا مظاہر سب پر عیاں ہیں' اس ہستی کے بارے جو شخص یہ گمان کرے کہ وہ مردوں کو از سرنو زندہ نہ کر سکے گی' اس کے عقل و فہم پر ماتم ہی کیا جانا چاہئے!)

(سورۃ القیامہ' آیات ۳۶ تا ۴۰)

جوامع الکلم

عدالت الٰہی کے کٹہرے سے ابن آدم کے قدم ہل نہ سکیں گے جب تک اس سے پانچ باتوں کے بارے میں پوچھ گچھ نہ کر لی جائے

..... اس کی عمر کے بارے میں کہ کہاں صرف کی!

..... اس کے دور جوانی کے بارے میں کہ کہاں گلایا!

..... اس کے مال کے بارے میں کہ کن ذرائع سے حاصل کیا!

..... اور کن مدات میں خرچ کیا!

..... اور آخری سوال' اس بارے میں کہ جو علم حاصل ہوا اس پر عمل کتنا کچھ کیا!

(اپنے معمولات شب و روز کی روشنی میں ہر شخص کو جائزہ لینا چاہئے کہ کیا اس نے اس محاسبہ سے نبرد آزما ہونے کا کوئی سامان کر رکھا ہے! اور کیا وہ اس عدالت میں جہاں بڑے سے بڑے جابر کو بھی دم مارنے کی مجال نہ ہو گی اور کوئی غلط بیانی سے کام نہ لے سکے گا' ان سوالات کے ایسے جوابات دے پائے گا جو عند اللہ مقبول قرار پائیں!)

(ترمذی : عن عبداللہ بن مسعودؓ)

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

○

تحریکِ خلافت پاکستان کا نقیب

ہفت روزہ
ندائے خلافت
لاہور

بانی مدیر : اقتدار احمد مرحوم

جلد ۵ شمارہ ۱۹

۱۳/ مئی ۹۶ء

10

ایڈیٹر

حافظ عاکف سعید

○

یکے از مطبوعات

تحریک خلافت پاکستان

۴ ۔ اے، مزنگ روڈ، لاہور

○

مقام اشاعت

۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون : ۳۔۵۸۶۹۵۰۱

○

پبلشر: محمد سعید اسعد طابع : رشید احمد چودھری

مطبع : مکتبہ جدید پریس، ریلوے روڈ لاہور

○

قیمت فی پرچہ : ۸ روپے

سالانہ زرتعاون (اندرون پاکستان) ۱۵۰ روپے

○

زرتعاون برائے بیرون پاکستان

☆ ترکی، اومان، مصر ۱۳/ امریکی ڈالر

☆ سعودی عرب، کویت، بحرین، قطر، عرب امارات، بھارت، بنگلہ دیش، یورپ، جاپان ۲۰ امریکی ڈالر

☆ امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ ۲۶ امریکی ڈالر

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

ایڈیٹر کے ڈیسک سے!

مرکزیہ مجلس اقبال کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے یوم اقبال کے جلسے میں اس سال امیر تنظیم ڈاکٹر اسرار احمد بھی بطور مقرر مدعو تھے۔ معمول کے مطابق اس جلسے کو ۲۱/ اپریل کے دن منعقد ہونا تھا لیکن حکومت وقت نے بوجوہ اس کی اجازت نہ دی ---- اس کی وجوہات چونکہ اخبارات کے ذریعے قارئین کے سامنے آ چکی ہیں اور ان کا کسی قدر تذکرہ بڑی عمدگی کے ساتھ محترم جنرل (ریٹائرڈ) محمد حسین انصاری نے "حدیث امروز" میں کر بھی دیا ہے لہٰذا یہاں اس کا تفصیلی ذکر غیر ضروری ہے ---- ۱۹ تا ۲۲ اپریل چونکہ آل پاکستان ملتزم رفقاء کا مشاورتی و تربیتی اجتماع پہلے سے طے تھا اور اس اہم تنظیمی پروگرام میں ذمہ داری کا سب سے بڑھ کر بوجھ امیر تنظیم ہی کے کاندھوں پر تھا لہٰذا امیر تنظیم نے یوم اقبال کے جلسے میں شرکت سے معذوری ظاہر کی۔ لیکن پھر جب یوم اقبال کے جلسے کے لئے تاریخ کا از سر نو تعین ہوا اور جمعہ ۲۶ اپریل کی تاریخ کا اعلان ہوا تو امیر محترم کا وہ عذر ختم ہو گیا اور انہوں نے اس پروگرام میں شرکت کی حامی بھر لی۔

اس روز یوم اقبال کے اس جلسے سے امیر تنظیم کا خطاب غیر معمولی طور پر متاثر کن تھا۔ الحمرا ہال نمبر ۲ اپنی تنگ دامانی کا گویا چیخ چیخ کر اعتراف کر رہا تھا۔ ہال میں کوئی ایک انچ جگہ خالی نہیں تھی، محض محاورتاً نہیں، فی الواقع تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مزدور لیڈر خورشید صاحب کے ہمراہ محنت کشوں اور مزدور بھائیوں کا ایک سیلاب ہال میں داخلے کے لئے تگ و دو کر رہا تھا۔ تمام نشستیں بالکل آغاز ہی میں پر ہو چکی تھیں۔ فلک شگاف نعروں کے جلو میں ہال میں داخل ہونے والے محنت کش بھائیوں کے ریلے کے لئے ہال کی سیڑھیاں، گزرگاہیں، سٹیج کے سامنے خالی فرش اور خود سٹیج کا فرشی حصہ بھی ناکافی ثابت ہوا اور ہال کے دروازے پر انبوہ کی صورت میں موجود ان کی ایک بڑی تعداد تادیر اندر داخلے کے لئے اپنی سی کوشش میں مصروف رہی۔ اس ہنگامہ ہائے ہاؤ ہو میں امیر تنظیم کی تقریر شروع ہوئی تو مجمع پر سناٹا چھا گیا۔ پورا مجمع سکوت کے عالم میں گوش بر آواز تھا۔ (تقریر کے مندرجات کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے، محترم انصاری صاحب نے "حدیث امروز" میں اس کے بعض مندرجات کا حوالہ دیا ہے، جو رہ گیا ہے اسے بھی جلد "ندائے خلافت" یا "میثاق" میں شائع کر دیا جائے گا۔) ہم یہاں مجلس کے صدر سابق چیف جسٹس جناب نسیم حسن شاہ صاحب کے ان ریمارکس کے ذکر پر اکتفا کریں گے جو انہوں نے اپنے صدارتی خطبے میں امیر تنظیم اسلامی کے خطاب کے بارے میں دیئے۔ انہوں نے فرمایا کہ یہ اچھا ہی ہوا کہ اس سال یوم اقبال کا جلسہ ۲۱/ اپریل کی بجائے ۲۶ کو منعقد ہوا۔ اس لئے کہ ۲۱/ اپریل کو اگر یہ منعقد ہوتا تو ہم ڈاکٹر اسرار احمد کے خطاب سے محروم رہتے۔ بلاشبہ یہ بہت بڑا خراج تحسین ہے جو محترم جسٹس صاحب کی طرف سے عطا ہوا۔

تاہم یوم اقبال کے اس جلسے میں وہ بظاہر ناخوشگوار واقعہ بھی پیش آیا جو آج کل اخبارات میں بحث و نزاع کا موضوع بنا ہوا ہے۔ جلسے کے آغاز میں قومی ترانہ کی دھن جب بینڈ کے ذریعے بجائی گئی تو معمول کے مطابق سب لوگ اس کے احترام میں باادب کھڑے ہو گئے۔ جبکہ امیر تنظیم اسلامی اس ضمن میں چونکہ پہلے سے ایک رائے رکھتے ہیں اور ان کی وہ رائے ۸۲ء میں بھی اخبارات میں بحث و نزاع کا موضوع بن کر پورے طور پر منظر عام پر آ چکی تھی، لہٰذا انہوں نے اپنے اس موقف پر قائم رہتے ہوئے کھڑے ہونے سے گریز کیا اور پوری استقامت کے ساتھ لوگوں کی چبھتی ہوئی نگاہوں کا سامنا کیا۔ تاہم امیر تنظیم کا یہ طرز عمل بہت سے لوگوں کے لئے ناقابل فہم تھا۔ اس کی مفصل وضاحت امیر تنظیم نے ۳ مئی کے خطاب جمعہ میں فرمائی جسے بعض اخبارات نے ایک بار پھر باقاعدہ بحث و نزاع کا موضوع بنا لیا۔

اس ضمن میں امیر محترم کی رائے جن مضبوط دلائل پر استوار ہے اس پر مشتمل ان کی ایک جامع تحریر جون ۸۲ء کے میثاق میں شائع ہو چکی ہے، جسے آج تک کسی حلقے نے چیلنج نہیں کیا بلکہ بعض چوٹی کے علماء کی طرف سے اس کی توثیق و تصویب ہی اب تک سامنے آئی ہے۔ وہ تحریر، اللہ نے چاہا تو آئندہ پرچے میں شائع کر دی جائے گی جس کے ذریعے امیر محترم کا موقف صحیح سیاق و سباق میں اور صغریٰ کبریٰ کے ساتھ قارئین کے سامنے آئے گا۔○○

خلیفہ اور پوپ میں زمین آسمان کا فرق ہے

خلافت کے خاتمے کے باعث مسلمان' اسلام کے ایک بہت بڑے حصے سے محروم ہو چکے ہیں

تمام مسلمانوں کی نمائندہ اسمبلی یا کانگریس امت کو درپیش اہم مسائل پر بحث کر سکتی ہے!

تحریر : عمران ابن حسین

جناب عمران این حسین کا آبائی تعلق جزائر غرب الہند سے ہے اور آج کل امریکہ میں مقیم ہیں۔ معروف مذہبی و سیاسی رہنما مولانا شاہ احمد نورانی کے والد ماجد مولانا عبدالعلیم" میرٹھی نے اس علاقے میں تبلیغ اسلام کا بہت موثر کام کیا تھا جس کے نتیجے میں عمران این حسین کا تعلق بھی اسی خانوادے سے قائم ہوا۔ چنانچہ ان کی تعلیم و تربیت میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری مرحوم کا بہت حصہ ہے جو مولانا عبدالعلیم" کے داماد تھے اور جنہوں نے کراچی میں نارتھ ناظم آباد کے بلاک "بی" میں ایک تعلیمی مرکز "اسلامک سنٹر" کے نام سے قائم کیا تھا۔ پھر ان ہی کی صاحبزادی سے عمران صاحب کی شادی بھی ہوئی ---- اور وہ بھی کچھ عرصہ "اسلامک سنٹر" کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کراچی میں مقیم رہے ---- (اور پیش نظر مقالہ انہوں نے ان ہی دنوں امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کے حوالے کیا تھا۔) لیکن چونکہ خود ان کا اپنا ذہن اور دائرہ نظر بحمد اللہ بہت وسیع ہے لہٰذا وہ پاکستان کے مخصوص فرقہ پرستانہ ماحول میں فٹ نہ ہو سکے اور واپس چلے گئے۔ تاہم ایک خاص پس منظر سے متعلق ہونے کے باعث ان کی تحریر میں دوسروں کے لئے بعض "نوکیلے" الفاظ بھی در آئے ہیں قارئین ان سے صرف نظر کرتے ہوئے اصل نفس مضمون پر توجہ مرکوز رکھیں!

ڈاکٹر اسرار احمد اور جناب عمران حسین کے مابین ایک نقطہ اتصال یہ بھی ہے کہ جب ۶۳-۶۴ء میں ڈاکٹر صاحب کراچی یونیورسٹی میں باضابطہ داخلہ لے کر ایم اے (اسلامیات) کر رہے تھے تو ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری مرحوم وہاں "تقابل ادیان" کے استاد تھے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب کو بھی ان سے نسبت تلمذ حاصل ہے۔

محترم عمران صاحب نے اپنا یہ مقالہ : FROM ISTANBUL TO RABAT کے عنوان سے گریجوایٹ انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل سٹڈیز' جنیوا سے ڈاکٹریٹ حاصل کرنے کی غرض سے ۱۹۸۷ء میں مکمل کیا تھا جسے قارئین کی دلچسپی کے لئے اردو میں ڈھال کر ان شاء اللہ "ندائے خلافت" میں مختلف اقساط میں پیش کیا جائے گا۔ تاہم ادارہ کا مصنف کی تمام آراء سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

ذیل میں اس کی پہلی قسط حاضر ہے۔ مقالے کا پہلا باب چونکہ بعض فنی مباحث پر مشتمل ہے لہٰذا اس کی اشاعت کا آغاز ہم دوسرے باب سے کر رہے ہیں۔ اصل مقالہ انگریزی میں ہے۔ (ادارہ)

خلافت' حجاز اور سعودی قومی ریاست

امت کی چودہ صدیوں کی تاریخ میں کوئی ایک بھی حکمران ایسا نہیں گزرا جس نے خلافت کا دعویٰ کیا ہو اور اس پر امت کا اجماع ہو گیا ہو لیکن حجاز' بالخصوص حرمین (مکہ' مدینہ) پر اس کا کنٹرول نہ ہو۔ امت کے نزدیک خلیفہ کا منصب اور حرمین پر اقتدار ہمیشہ سے یکجا تصور کیا جاتا رہا ہے۔ اس کی ایک شرعی حیثیت بھی ہے۔ چونکہ حج کی ادائیگی ہر صاحب استطاعت مسلمان پر لازم ہے جس کے لئے حجاز کا سفر ناگزیر ہوتا ہے اس لئے یہ ممکن نہیں کہ مسلمانوں کے حکمران اعلیٰ کے پاس حج کے انتظامات کا اختیار نہ ہو اور ان انتظامات کے ضمن میں حجاز پر کنٹرول نہ ہو۔ چنانچہ اس وقت بھی جب دارالخلافہ حجاز سے کوفہ (عراق)' دمشق' بغداد' قاہرہ یہاں تک کہ استنبول منتقل ہوتا چلا گیا' جو بھی خلیفہ کا عہدہ سنبھالتا' حجاز پر اپنا اقتدار قائم کرنے پر خصوصی توجہ مرکوز کرتا۔ چنانچہ یہ سلسلہ بغیر کسی رکاوٹ کے پہلی جنگ عظیم میں خلافت عثمانیہ کے خاتمے تک قائم رہا۔

اسلام پر مغربی تہذیب کے غلبے اور عالم اسلام میں سیکولر نظام قائم کرنے کے لئے حجاز پر مغرب کا تسلط ضروری تھا تاکہ خلافت کو کمزور کر کے بالآخر بالکل ختم کر دیا جائے ورنہ جب تک خلافت موجود رہے گی' اسے مسلمانوں کے مرکز اور یکجہتی کی حیثیت حاصل رہے گی چنانچہ برطانیہ نے پہلی جنگ عظیم کے دوران سب سے پہلا کام یہ کیا کہ عثمانیوں کے مقرر کردہ شریف مکہ' شریف حسین سے بغاوت کرا کر حجاز پر اس کی حکومت قائم کروادی۔ ۱۹۱۶ء تک زیریں حجاز یعنی مکہ اور جدہ عثمانیوں کے ہاتھ سے جا چکا تھا' تاہم جنگ کے عرصے میں مدینہ پر سلطنت عثمانیہ کا کنٹرول باقی رہا۔ ۱۹۱۹ء میں بعض عثمانی سپاہیوں نے اپنے جانباز لیڈر' فخری پاشا کے خلاف بغاوت کر کے گویا قصہ ہی تمام کر دیا۔

ادھر ۱۹۱۹ء میں جنرل ایلن بی کی سرکردگی میں برطانوی فوجوں نے یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ یہ بات خاص طور پر نوٹ کرنے کی ہے کہ ایلن بی نے اس مقدس شہر میں داخل ہوتے وقت بڑے فخر سے اعلان کیا کہ "صلیبی جنگوں کا اب ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو گیا"۔ جزیرہ نمائے عرب میں برطانوی سازشوں سے اسلام کو درپیش خطرے کے بارے میں اگر کسی کے دل میں کوئی شبہ تھا بھی تو ایلن بی کے اس اعلان سے وہ دور ہو جانا چاہئے تھا۔ بہرحال حجاز کے ہاتھ سے نکل جانے کے چند سال بعد سلطنت عثمانیہ کا بھی خاتمہ ہو گیا جو بلاشبہ برطانیہ کی حکمت عملی کی ایک شاندار کامیابی تھی۔ ۳ / مارچ ۱۹۲۴ء کو جب بالآخر خلافت عثمانیہ کی مکمل طور پر بساط لپیٹ دی گئی تو رہی سہی امیدوں پر بھی پانی پھر گیا۔

۷/ مارچ ۱۹۲۴ء کو شریف حسین نے بڑی مستعدی سے اپنے خلیفہ ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اس کے پاس سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ حجاز پر بالفعل اس کا کنٹرول تھا۔ مزید براں اس نے ہاشمی ہونے کی بھی شیخی بگھاری' یعنی اپنا تعلق قریش کے بنو ہاشم قبیلے سے' جس سے کہ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم تھے' جتلایا۔ علماء ان کے اس فریب سے اس درجے متاثر ہوئے کہ ماورائے اردن کے چیف قاضی نے ان کے اس دعویٰ پر صاد کرتے ہوئے انہیں فوراً خلیفہ تسلیم

کر لیا۔ ان کی ایک اور خوبی جو اگرچہ مسلم عوام کے نزدیک غیر معتبر تھی مگر خطے میں سیاسی جوڑ توڑ کے لحاظ سے اس کی بڑی اہمیت تھی' یہ تھی کہ ان کی پشت پر اس وقت کی عظیم طاقت' برطانیہ تھا جس نے عثمانی تسلط کے خلاف بغاوت اور حجاز پر قبضہ کرنے میں ان کی مالی' سفارتی اور فوجی امداد کی تھی۔ ادھر جزیرۃ العرب کے بارے میں برطانوی پالیسی مختلف مقاصد لئے بڑی جامعیت کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھی۔ سب سے پہلے اس کے پیش نظر حرمین کو خلیفہ کے کنٹرول سے آزاد کرانا تھا تاکہ مسلمانوں کی مرکزیت باقی نہ رہے' ساتھ ہی حجاز میں ایک حلیف حکومت کا قیام ضروری تھا تاکہ آئندہ بھی سیاسی جوڑ توڑ کا موقعہ فراہم رہے اور ان سب پر مستزاد فلسطین میں ایک یہودی ریاست کا قیام تھا جس کا پیش خیمہ ۱۹۱۶ء کا سائیکس ۔ پکاٹ (Sykes-Pikot) معاہدہ اور ۱۹۱۷ء کا اعلان بالفور تھا۔

مسلمانوں کی مرکزیت ختم کرنے میں پورا مغرب یکجا تھا جس کے دباؤ میں آکر اس سے قبل سلطنت عثمانیہ کو ذمہ اور جزیہ ختم کر دینا پڑا تھا۔ برطانیہ اور صیہونیت کے علم میں تھا کہ فلسطین میں قائم ہونے والی اسرائیل کی یہودی ریاست اس وقت تک مسلسل خطرے سے دوچار رہے گی جب تک مسلمانوں کے لئے ایک خلیفہ موجود ہے۔ اس لئے برطانیہ کے لئے شریف حسین کی خلافت میں بھی اندیشے کا پہلو تھا کیونکہ آگے چل کر یہ سلسلہ جڑ پکڑ سکتا تھا چنانچہ برطانیہ نے شریف حسین سے کام نکال لینے کے بعد عبدالعزیز ابن سعود کی پیٹھ ٹھونکی اور اسے شریف حسین کے مقابلے میں لا کھڑا کیا' دوران جنگ ہی اس مقصد کے لئے برطانیہ نے ابن سعود کے ساتھ ساز باز کر رکھی تھی اور ۵ ہزار پونڈ ماہانہ کے عوض اسے رام کر لیا تھا۔ نجد میں سعودی طاقت اس اتحاد کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی جو وہابی فرقے کے راہنما اور سعودی قبیلے کے سربراہ کے درمیان قائم ہوا تھا۔ اس کی رو سے حکمرانی کا حق سعود خاندان کو دیا گیا اور مذہبی معاملات میں وہابی فرقے کی عملداری تسلیم کی گئی تھی۔ ۱۹۰۲ء میں ریاض پر قبضے کے بعد یہ اتحادی طاقت نمایاں طور پر سامنے آئی۔

خلافت پر ہاشمیوں کے دعویٰ کے چار روز بعد ابن سعود نے حسین کے خلاف فوجی کارروائی شروع کر دی۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس وقت یروشلم پر یہودی قبضے اور حجاز پر وہابی قبضے' دونوں کے لئے خلافت کا قیام خطرے کا باعث تصور کیا جا رہا تھا مگر برطانیہ اس بارے میں مطمئن تھا کہ حجاز میں سعودی وہابی حکمرانوں کے ہوتے ہوئے خلافت کا بحال ہونا ممکن نہیں رہے گا۔ کیونکہ وہابی خلیفہ باقی دنیا کے مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو گا۔ بہرحال برطانیہ کی پشت پناہی حاصل ہونے پر چند ماہ کے اندر ابن سعود نے مکہ فتح کر کے شریف کو جدہ بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ بالآخر برطانیہ نے شریف کو قبرص میں پناہ دے کر جدہ اور مدینہ کو سعودیوں کے حوالے کر دیا۔ گزشتہ ایک صدی سے زائد عرصے میں سعودی' وہابی اتحاد زبردست خونریزی کے بعد مکہ اور طائف پر پوری طرح قابض ہو چکا تھا۔ انہوں نے حجاز میں رہنے والے عام مسلمانوں کو مشرکین مکہ پر محمول کرتے ہوئے بے دریغ قتل کرنا شروع کیا جس پر استنبول میں مقیم خلیفہ نے مصر کے مملوک خدیو' محمد علی سے کہا کہ وہ اپنے بیٹے اسمٰعیل کو فوج دے کر حجاز بھیجے۔ اس نے سعودی ۔ وہابی جنگجوؤں کو حجاز سے نکال کر صحرا کی طرف دھکیل دیا لیکن ایک صدی بعد جب خلافت ہی باقی نہ رہی اور مسلمانوں کے تمام طاقتور خطے علاقے سامراج کے شکنجے میں جکڑے گئے تو حرمین اور حجاز پر سعودی تسلط ختم کرانا کسی کے بس میں نہ رہا' خصوصاً جب اسے برطانیہ عظمیٰ جیسی طاقت کی پشت پناہی حاصل تھی۔

اگرچہ حجاز پر ابن سعود کا مکمل کنٹرول تھا لیکن دنیا میں بسنے والے کروڑوں غیر وہابی مسلمانوں کے ساتھ ہم آہنگی اور امت کے اتحاد کا مسئلہ ابھی طے ہونا باقی تھا چنانچہ انہوں نے پوری دنیا کے مسلمانوں کے نام ایک اعلان جاری کیا کہ سرزمین حجاز اور حرمین سب کے لئے ہے' ابن سعود کی حیثیت امانت دار کی ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ مسلمان اپنے نمائندے مکہ بھیجیں تاکہ اس مقصد کے لئے شوریٰ اور اجماع کی بنیاد پر ایک عادل' اہل اور نمائندہ انتظامیہ مقرر کی جائے۔ یہ اعلان اسلام کے تقاضوں کے عین مطابق تھا' ابھی حجاز کی حیثیت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے قائم کردہ دارالسلام کی تھی' لیکن یہ خوبصورت اعلان صرف دکھاوے کے لئے تھا اصلاً اس کا مقصد الازہر کے اس اقدام کا توڑ کرنا تھا جو خلافت عثمانیہ کے خاتمے کے نتیجے میں کیا گیا تھا۔ الازہر کی طرف سے تجویز پیش کی گئی تھی کہ قاہرہ میں ایک بین الاقوامی اسلامی خلافت کانفرنس منعقد کی جائے جو دیگر امور کے علاوہ مسلمانوں کے لئے ایک خلیفہ کا تقرر کرے۔ وہابی بڑے زور شور سے اس بات کی تلقین کرتے رہے تھے کہ خلافت راشدہ کے بعد سے صحیح معنوں میں خلافت قائم نہیں رہی لہٰذا انہیں الازہر کی اس تجویز کا خیر مقدم کرنا چاہئے تھا لیکن اس کے برعکس انہوں نے موقع پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس تجویز کو ناکام بنانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور قاہرہ کانفرنس کے متبادل کے طور پر ۱۹۲۶ء کے حج کے موقعہ پر مکہ میں ایک کانفرنس منعقد کرنے کی تیاری شروع کر دی جس کے دائرہ کار سے خلافت کا مسئلہ سرے سے خارج تھا۔ برطانوی حکمت عملی کا یہ شاہکار تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے جو پورے عالم اسلام میں خلافت کے سب سے زیادہ شیدائی تھے اور خلافت عثمانیہ کے حق میں زبردست تحریک چلا چکے تھے' مئی/جون ۱۹۲۶ء میں قاہرہ کانفرنس کی بجائے جولائی ۱۹۲۶ء کی مکہ کانفرنس میں شرکت کی۔ بہرحال مکہ کانفرنس کامیاب رہی اور اسلام کے مرکز حجاز پر ایک قومی ریاست کے قیام سے خلافت کا مسئلہ طویل عرصے کے لئے پس پشت چلا گیا۔ اب تک کی تمام تر کاوشوں کا ہدف یہ قرار پایا کہ اسلام رائج کر کے قومی ریاست کی نہج پر ایک اسلامی ریاست وجود میں لائی جائے گی جو آج تک تشنہ تکمیل چلا آ رہا ہے۔

علامہ اقبال اور مولانا مودودی' دونوں نے مابعد خلافت دور میں اسلامی نظام سے متعلق اجتہادی کاوش کی جس کا حاصل ایک اسلامی ریاست کا قیام تھا جو بدقسمتی سے حقیقی نظام اسلام یا امت کے سیاسی مرکز کے قیام سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے عالم اسلام کی سیاسی سوچ غلط رخ پر مڑ گئی جو آج بھی اسی غلط رخ پر جاری ہے چنانچہ خلافت کے بعد کی صورتحال اور موجودہ عالمی تناظر میں نظام اسلام کے تقاضوں کو سمجھنے کے لئے ہمیں قاہرہ' مکہ اور بعد میں منعقد ہونے والی کانفرنسوں کا قدرے تفصیل سے جائزہ لینا ہو گا۔

پہلی جنگ عظیم

پہلی جنگ عظیم کہنے کو تو یورپ کی جنگ تھی لیکن اس سے عالم اسلام میں جو نشیب و فراز آئے ان کی مثال مسلمانوں کی ۱۳ صدیوں کی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اولاً : اس وقت کی عظیم مسلم طاقت اور خلافت پر متمکن' سلطنت عثمانیہ کا جنگ میں مرکزی قوتوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ اگرچہ آج تک ایک متنازعہ امر شمار ہوتا ہے کیونکہ جنگ میں حصہ لیں یا نہ لیں اور کس کا ساتھ دیں۔ کس کا نہ دیں جیسے امور پر عثمانی قیادت آخری وقت تک مخمصے کا شکار رہی' لیکن گمان یہ ہے

کہ اس فیصلے کے پیچھے انگریزوں اور یہودیوں کا ہاتھ تھا۔ یہودی راہنما جنہیں برطانیہ کی تائید حاصل تھی اس سے قبل یروشلم کا کنٹرول حاصل کرنے کی ناکام کوشش کرتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ اسے خریدنے کی کوشش بھی کی گئی لہٰذا جنگ میں برطانیہ کے پیش نظر ایک اہم مقصد مسلمانوں کو کمزور کر کے فلسطین میں یہودی ریاست قائم کرنا بھی تھا۔ عثمانی قیادت غالباً جنگ میں سارے عالم اسلام کو ساتھ لینا چاہتی تھی چنانچہ سلطنت عثمانیہ کے شیخ الاسلام نے ۲۳ / نومبر ۱۹۱۴ء کو اتحادی طاقتوں کے خلاف لڑنے کا فتویٰ جاری کیا۔ لیکن برطانیہ عرب قومیت کو ہوا دے کر مسلمانوں کی اس عالمگیر قوت میں شگاف ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ جنگ شروع ہونے کے دو سال کے اندر برطانیہ کی شہ پر شریف حسین نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر کے مسلمانوں کے مرکز' حجاز پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ مکہ اور مدینہ ہاتھ سے نکل جانے سے عثمانوی قیادت کو زبردست دھچکا لگا۔ برطانیہ نے اگلا اقدام یہ کیا کہ عراق اور ماورائے اردن کی بادشاہی حسین کے دو بیٹوں کو سونپ دی۔ ۱۹۱۹ء تک برطانوی جرنیل ایلن بی عرب فوجوں کو لے کر لڑتا ہوا یروشلم جا پہنچا۔ لیگ آف نیشنز نے فلسطین پر برطانوی تسلط کی توثیق کر دی۔ ۱۹۴۸ء میں برطانیہ نے فلسطین کو خالی کر کے وہاں اسرائیل کی ریاست قائم کر دی۔

جنگ میں سلطنت عثمانیہ کو بری طرح شکست ہوئی ۔ اتحادی اس جنگ میں بڑی چالاکی سے مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے میں کامیاب رہے۔ برطانیہ اور فرانس نے ہندوستان کے مسلمانوں اور عربوں کو ساتھ ملا کر ترک مسلمان بھائیوں کے خلاف لڑایا جس سے عالمگیر مسلمان بھائی چارے کی بنیادیں ہل گئیں۔ تاہم مصطفیٰ کمال کی سرکردگی میں ترکی کی قومی فوج نے بے جگری سے لڑتے ہوئے اپنے ملک کو یورپی طاقتوں کے قبضے میں جانے سے بچا لیا۔

ترک قوم پرست اور خلافت

ترکی کی نیشنلسٹ قوتیں ۵۰ سال سے سلطان کے خلاف نبرد آزما تھیں جسے وہ شخصی آمریت پر محمول کرتی تھیں لہٰذا یہ قوتیں دستوری حکمنامے کے ذریعے سلطان کے اختیارات محدود کرانے کے درپے تھیں۔ ترکی کی نیشنلسٹ قوتیں سلطنت عثمانیہ کے مقابلے میں مغربی تہذیب کی برتری کا باعث سیکولرزم کو قرار دیتی تھیں ادھر جب نہ صرف مکہ اور مدینہ ہاتھ سے جاتا رہا بلکہ جنگ میں مسلمانوں نے اپنے ترک بھائیوں پر گولیاں چلائیں تو عالم اسلام کا ایک جو آپس کا رشتہ چلا آ رہا تھا وہ خود بخود ٹوٹ گیا جس سے ان قوتوں کو موقعہ مل گیا کہ ترکی کی اسلامی حکومت کو ختم کر کے مغربی طرز کی جدید سیکولر قومی ریاست' جمہوریہ ترکی کی داغ بیل ڈالیں جس کا لازمی جزو ہی مذہب اور ریاست میں دوری ہے۔ چنانچہ ترکی کی نئی وجود میں آنے والی گرینڈ نیشنل اسمبلی نے ۱۹۲۲ء میں عبدالمجید کو خلافت کے عہدہ پر فائز کر کے گویا انہیں مسلمانوں کے مذہبی امور کا نگران مقرر کر دیا جبکہ دنیاوی معاملات سے انہیں فارغ کر دیا گیا۔

ترکی میں خلافت کا خاتمہ تو ہو گیا لیکن جس طرح یورپ والوں نے سلطنت روما کے خاتمے کے بعد عیسائیت کو بھی خیرباد کہہ دیا تھا اس طرح ترکی سے اسلام کو نکال باہر کرنا کسی کے بس کا روگ نہ اس وقت تھا' نہ آج ہے۔ خلیفہ اور پوپ میں جو فرق ہے اسے دور نہیں کیا جا سکتا۔ دوسری بات یہ ہے کہ چونکہ اسلام میں مذہب اور ریاست کی علیحدگی کا کوئی تصور نہیں لہٰذا سیاست میں سیکولرزم کی پیوندکاری کار عبث ہے۔ خلافت کو جو مقام حاصل ہے سیکولر نظام اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ سکتا اس کا اندازہ آپ اس سے کر سکتے ہیں کہ ترکی میں مصطفیٰ کمال کی طاقت کو کمزور کرنے کے لئے انگریزوں کو بالآخر ہندوستان میں تحریک خلافت کا ہی سہارا لینا پڑا۔ ادھر ترکی کے قوم پرستوں کو بھی بہت جلد اس کا اندازہ ہو گیا کہ اگر جرات سے کام نہ لیا گیا تو ریاستی امور دوبارہ اسلام کے قبضے میں چلے جائیں گے لہٰذا توقع کے عین مطابق ترکی کی گرینڈ نیشنل اسمبلی نے ۳ / مارچ ۱۹۲۴ء کو ایک قانون کے مطابق خلافت کی بساط ہی لپیٹ دی۔ اس کے لئے جو قانون منظور کیا گیا اس کے الفاظ یہ تھے :

"خلیفہ کو معزول کیا جاتا ہے۔ خلافت کا منصب منسوخ کر دیا گیا ہے' اس لئے کہ خلافت کے معنی ہی جمہور پر حکمرانی ہے"۔

امت کی تاریخ میں اس قانون کا منظور کیا جانا ایک فیصلہ کن موڑ کی حیثیت رکھتا ہے یہ پہلا موقعہ تھا کہ مسلمان خلیفہ سے کلیتاً محروم ہو گئے تھے ورنہ بد سے بدتر حالات میں بھی خلافت کا ادارہ موجود رہا تھا اور اب گویا یہ بات حتمی ہے کہ عالم اسلام خلافت کے بعد کے دور میں سانس لے رہا ہے۔

خلافت کا خاتمہ اور الازہر کا اقدام

خلافت کے خاتمے اور اس کی جگہ مغربی طرز کی سیکولر قومی ریاست کے قیام سے جو اہم تبدیلی عمل میں آ رہی تھی' علامہ اقبال جیسے عظیم مفکر بھی غالباً پوری طرح اسے سمجھنے سے قاصر رہے تھے اس لئے کہ خلافت اسلام کا جزو لازم ہے اور خلافت کا خاتمہ

حلوائی کی دکان

بقول سینیٹر طارق چودھری دارالحکومت اسلام آباد میں ۶ ارب روپے کے پلاٹ ارکان اسمبلی میں جن میں حکومتی اور اپوزیشن دونوں ارکان شامل ہیں' تقسیم کئے جا رہے ہیں۔

طارق چودھری نے اپنی پریس کانفرنس میں' جو عید کے روز چھپی ہے کہا ہے کہ اسلام آباد کا بلیو ایریا دنیا کا قیمتی ترین علاقہ ہے جو نیویارک اور ٹوکیو کے مہنگے ترین علاقوں سے بھی مہنگا ہے۔ پارلیمنٹ کا نزدیکی علاقہ ایک لاکھ روپے فی گز سے بھی اوپر ہے اور اس جگہ کے ۸ ایکڑ رقبہ پر ارکان اسمبلی کے لئے ۸۰ کروڑ روپے کی مالیت سے ۳۴۵ بنگلے تعمیر کئے جا رہے ہیں جس کی صرف زمین کی قیمت کا تخمینہ تقریباً چار ارب روپے ہے۔ لوٹ مار کی داستانیں یہیں ختم نہیں ہوتیں۔ عوامی حکومت نے اسلام آباد میں سیکٹر فائیو نئے سرے سے بنا کر اس میں بھی ارکان اسمبلی کے لئے ۳۵۰ پلاٹ مخصوص کر دیئے ہیں جن کی مجموعی مالیت ڈیڑھ ارب روپے کے لگ بھگ ہے۔

طارق چودھری نے کہا کہ یہ بات ناقابل فہم ہے کہ ۳۴۵ بنگلے بنانے کے بعد پھر یہ پلاٹ دینے کی کیا ضرورت ہے۔

طارق چودھری اس بات پر بھی حیران ہیں کہ ان لوگوں نے درخواستیں کیوں دی ہیں جن کے باپ داداؤں کے بنگلے اسلام آباد میں ہیں اور وہ کئی کئی پلاٹ پہلے بھی حاصل کر چکے ہیں۔

اسلام کے ایک بہت بڑے حصے سے گویا دستبرداری تھی لہٰذا اس کا مقابلہ اس پیمانے پر کیا جانا چاہئے تھا جس پیمانے پر تبدیلی واقع ہو رہی تھی۔ بہرحال ترکی کی اسمبلی میں اس قانون کی منظوری کے ۲۲ روز بعد قاہرہ میں الازہر یونیورسٹی کے ریکٹر نے یونیورسٹی اور دیگر اہم مصری علماء سے ملاقات کر کے خلافت کے مسئلے پر یہ اعلامیہ جاری کیا:

"خلافت' جو امامت کے ہم معنی ہے' دینی اور دنیاوی معاملات میں تمام مسلمانوں کا مسئلہ ہے کیونکہ یہ پوری ملت کے مفادات کی نگہداشت اور امت کے معاملات کو چلانے کی ضامن ہوتی ہے"

امام کی توضیح کے بارے میں علماء کا کہنا تھا کہ اس سے مراد:

"..... وہ نائب ہے جس کے ذمے مذہبی قوانین کی نشر و اشاعت' ان کا نفاذ اور دنیاوی معاملات کو شریعت کے مطابق چلانا ہوتا ہے"۔

"اہل حل و عقد کی طرف سے بیعت کے نتیجے میں یا بصورت دیگر اپنے پیشرو کی جانب سے بطور جانشین نامزدگی کے ذریعے امام کا تقرر عمل میں لایا جاتا ہے"۔

"اگر صورتحال ایسی ہو کہ کوئی فریق ناجائز طور پر خلافت پر قابض ہو جائے تو طاقت کے ذریعے بھی یہ منصب حاصل کیا جا سکتا ہے اور اس منصب کو مزید تقویت دینے کے لئے پہلے خلیفہ کو فتح حاصل کرنے والے شخص کی بیعت کرنے کا موقع دیا جا سکتا ہے۔ ماضی میں بیشتر خلفاء کا معاملہ اسی طرح کا رہا ہے"۔

بہرحال مصر کے علماء نے ترکی کی گرینڈ نیشنل اسمبلی کی طرف سے خلافت کے منصب پر عبدالمجید کے ایسے تقرر کو جس میں سیاسی اختیارات خلیفہ کی بجائے نیشنل اسمبلی کے پاس ہوں اور پہلے سے موجود خلافت کو ختم کر دیا گیا ہو اس بنا پر بدعت قرار دیا اور اس کی مذمت کی کہ اسلام میں اس سے پہلے ایسی کوئی مثال موجود نہ تھی۔ مزید براں ان علماء نے ایک اسلامی کانگریس بلانے کا فیصلہ کیا تاکہ اس میں تمام مسلمانوں کے نمائندے آ کر نئے خلیفہ کے تقرر کے بارے میں غور کریں۔ خلافت عثمانیہ کے خاتمے پر دنیا کے مسلمانوں کا یہ پہلا سنجیدہ ردعمل تھا لیکن اس میں جو تجویز سامنے لائی گئی تھی اپنی جگہ وہ خود اسلام کے روایتی طرز عمل سے مطابقت نہیں رکھتی تھی' بلکہ اسے بھی بدعت قرار دینا بے جا نہ ہو گا۔

الازہر کے علماء تمام دنیا کے مسلمانوں کے نمائندوں کی کانگریس کے ذریعے نئے خلیفہ کے انتخاب کی تجویز دے رہے تھے جبکہ پہلی صدی کے نصف اول سے لے کر اسلام کی پوری تاریخ میں کبھی بھی عوام نے خلیفہ کا انتخاب نہیں کیا تھا اور نہ ہی اس پوری تاریخ میں مسلمان عوام کی کسی اسمبلی یا کانگریس نے خلیفہ منتخب کیا تھا۔ چنانچہ یہ تجویز پہلے ہی مرحلے میں مشکلات کا شکار ہو گئی جس کمیٹی کو کانگریس کے انعقاد کی ذمہ داری سونپی گئی تھی وہ اصل مسئلے کو چھوڑ کر نئے خلیفہ کے انتخاب کے مسئلے میں الجھ کر رہ گئی' البتہ ایک بہت اہم بات یہ سامنے آئی کہ اسلام کی پوری تاریخ میں پہلی مرتبہ جید علماء کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ امت کو درپیش اہم مسائل پر مسلمانوں کی ایک نمائندہ اسمبلی یا کانگریس میں بحث کی جا سکتی ہے۔ تاہم یہ کہنا مشکل ہے کہ ایسا مغربی تہذیب کے زیر اثر کیا گیا تھا۔

یہ الگ بات ہے کہ مجوزہ کانگریس میں شوریٰ اور اجماع کے ذریعے جو فیصلہ ہوتا وہ خلافت کی نسبت حقیقی اسلام سے قریب تر ہوتا۔

امتحانات سے فارغ طلبہ کے لئے

دینی معلوماتی تربیتی کورس

18 مئی تا 27/ جون 1996ء (6 ہفتے)

قرآن کالج لاہور

میں منعقد ہوگا (ان شاء اللہ)' جس میں مندرجہ ذیل مضامین کی تدریس ہوگی:

1 ۔ نماز و قراءت قرآن کی تصحیح
2 ۔ مطالعہ دینی لٹریچر
3 ۔ قرآن حکیم کے منتخب اسباق
4 ۔ عربی گرامر (ابتدائی)
5 ۔ انگریزی گرامر
6 ۔ انگریزی/اردو خوشخطی
7 ۔ ارکان اسلام اور ان سے متعلق تفصیلات

نوٹ

- اس کورس میں رجسٹریشن کی آخری تاریخ 16 مئی 1996ء ہے۔
- اوقات تعلیم صبح 8 بجے سے 12 بجے دوپہر ہوں گے۔
- کورس فیس مبلغ 250 روپے ہے' جس میں جملہ کتب کی قیمت شامل ہے۔
- ہاسٹل میں رہائش کی محدود گنجائش ہے۔
- ہاسٹل میں 6 ہفتے کے قیام و طعام کا خرچ 1000 روپے ہو گا۔
- مستحق طلباء کے لئے رعایت کی گنجائش ہے۔
- تدریس کا آغاز ان شاء اللہ 18 مئی سے ہو جائے گا۔

المعلن : پرنسپل قرآن کالج لاہور

191۔ اتاترک بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور۔ فون : 5833637

زیر اہتمام : مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

حسنی مبارک سزائیں دینے میں بڑے "فراخ دل" ہیں!

قاتلوں کو توقع تھی کہ سادات کے جانشین رواداری سے کام لیں گے

نوجوان تنظیم "جماعت اسلامیہ" کے مقابلے میں اب پرانی "اخوان المسلمون" حکومت کو زیادہ قابل قبول ہے

مضمون کا مصنف فواد عجمی جانس ہوپ کنز یونیورسٹی کے سکول آف ایڈوانس اسٹڈیز میں مڈل ایسٹرن اسٹڈیز کا پروفیسر ہے

۱۶/ اکتوبر ۱۹۸۱ء کو انور سادات کے قتل کے ایک نسل کے برابر وقفے میں سادات اور ان کے قاتل خالد استنبولی کے درمیان ایک عجیب قسم کا تعلق دکھائی دیتا ہے۔ قومی داستان میں دونوں ہی شخصیات جگہ پا چکے ہیں۔ مصر کی تاریخ اور اس کی شناخت میں اتنی لچک ہے کہ وہ عیار حکمران اور اس کے قاتل دونوں کو نگل سکتی ہے۔ ایک نفاخر کو قربان کر کے اسرائیل اور امریکہ کے ساتھ معاملہ کر بیٹھا' جبکہ دوسرا سودے بازی میں ادا کردہ ثقافتی قیمت پر دہشت زدہ ہو گیا۔ ایک لحاظ سے سادات اور استنبولی جڑواں بھائی ہیں۔ ان کی زندگیاں اور کارنامے ملک میں تسلسل کے ساتھ جاری المیوں کی ایک عظیم داستان ہے۔ ایسی سیاسی شخصیات کے ہاتھوں مصائب کی بازگشت ہے' جنہیں مصر کی تاریخ نے ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائی میں انقلابی تجربات کے دوران آگے بڑھایا تھا۔

مصریوں کے لئے استنبولی کے پیرائے میں اپنی تاریخ کو سمجھنا زیادہ مشکل نہیں۔ وہ نوجوان لیفٹیننٹ' جس نے فخر کے ساتھ اعلان کیا کہ اس نے فرعون کو قتل کیا ہے' وہ ہر لحاظ سے ۲۳ جولائی ۱۹۵۲ء کے جمال عبدالناصر کے آزاد انقلابی افسروں میں سے ایک تھا جب مصر نے اپنے بادشاہوں کو ایک جانب رکھا اور نیا' غیر وابستہ راستہ اختیار کیا۔ استنبولی ۱۹۵۷ء میں نہر سوئز کے بحران' جو مصر کی زندگی میں ایک نادر وقت تھا' کے ایک سال بعد پیدا ہوا۔ اس کا نام ناصر کے بڑے بیٹے کے نام پر رکھا گیا۔ اس کا باپ ایک سرکاری کمپنی' جو کہ نئی وسعت پذیر حکومت کی تخلیق کردہ تھی' میں ایک وکیل تھا۔ وہ دس سال کا تھا' جب ۶ روزہ جنگ میں تباہی نے مصر پر وار کیا۔ جبکہ ناصر کے انقلاب کو قوت' جوش و خروش اور فریب نظر کا پیکر خیال کیا جاتا تھا۔ ملک ایک گرداب میں تھا اور استنبولی کی زندگی گویا کامیابیوں اور ناکامیوں کا پرتو تھی۔

وہ کچھ زیادہ مذہبی نہیں تھا اور مصر کے ایک کرسچین مشنری سکول میں پڑھتا رہا تھا۔ سیاسی اسلام اس کی زندگی میں ذرا دیر بعد داخل ہوا۔ لیکن اتنی تاخیر سے بھی نہیں کہ وہ اپنی زندگی کا پرتشدد کارنامہ انجام نہ دے پاتا۔ اس کے بڑے بھائی کو جو مذہبی اور سرگرم کارکن تھا' ستمبر ۱۹۸۱ء میں سادات کے حکم پر وسیع پیمانے پر گرفتاریوں کے دوران گرفتار کیا گیا۔ تمام دھڑوں سے وابستہ سیاسی مردوں اور عورتوں کو گھیر کر جیل میں ڈال دیا گیا۔ ان میں اشرافیہ کے سرکردہ افراد' قانون اور صحافت سے وابستہ لوگ' یونیورسٹی پروفیسر' سابق وزراء مسلمان اور عیسائی سب شامل تھے۔ گرفتاریوں کی یہ لہر سادات کا مایوسانہ اقدام تھا' جس کا ردعمل سامنے آیا۔ اس کے نتیجے میں سادات اور اس کے ملک کے درمیان اخلاقی معاہدہ ٹوٹ گیا۔ انتقام لینے میں استنبولی نے وہ کیا' جو ایک معمول کا معاشرہ اپنے لئے اب نہیں کرتا۔ ایک سرکردہ مصنف نے قاتل کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا: "میں بولا اور تو نے کر دکھایا۔ میں نے اور دوسروں نے سوچا اور تم نے ہماری سوچوں کو پورا کر دیا"۔

تاہم سادات کا بھی ایک مقام ہے اور یہ ملک کے حافظے میں خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ سچ ہے کہ سادات ایک دلگیر موت سے دوچار ہوئے' تاہم اکتوبر ۱۹۷۳ء میں اسرائیل کے خلاف جنگ میں فتح کے باوجود انہیں اپنے پیشرو' جس نے ۱۹۶۷ء میں شکست کھائی تھی' کے مقابلے میں کمتر خیال کیا گیا۔ ان کے کریڈٹ میں یہ بات آتی ہے کہ انہوں نے عرب ریڈیکل ازم سے ناطہ توڑا اور آنے والے سالوں میں یہ عیاں ہو گیا کہ ریڈیکل ازم کے پنپنے کی عرب دنیا میں گنجائش نہیں ہے۔

انہوں نے اسرائیل کے ساتھ امن کا انتخاب کیا۔ فلسطینی اور دیگر عرب' جن میں سے اکثر ان پر غداری اور بغاوت کے الزام لگاتے تھے' ان کے نقش قدم پر چلے۔ یہ طاقتور حکمران' جو دیہاتی پس منظر کا حامل تھا اور جس میں کسان کی سی فطری چالاکی اور دانشمندی تھی' دوسروں پر واضح ہونے سے پہلے یہ جانچ چکا تھا کہ امریکی قوت کے ساتھ سویت یونین کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ یہ بات ان کے عوام سے اوجھل نہیں ہوئی کہ سادات نے امریکہ کی بالادستی کا قبل از وقت اندازہ لگا لیا تھا اور انہوں نے اپنی رقم امریکی گھوڑے پر لگاتے ہوئے امریکہ کے ساتھ اس قسم کی مفاہمت اختیار کی' جسے ان کے مغرور پیش رو بمشکل ہی اپنا سکتے تھے۔ پھر انہوں نے اپنی قوم کو جو تحفہ دیا' وہ اس علاقے کی بازیافت کا تھا' جو ۱۹۶۷ء میں ان کے پیشرو نے گنوا دیا تھا۔ استنبولی اور اس کے چار رفقائے جرم کی ۲۵/ اپریل ۱۹۸۲ء کو سزائے موت کے بعد اسرائیل نے جزیرہ نما سینائی مصر کے حوالے

> "اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ مصر کا نابینا مبلغ شیخ عمر عبدالرحمٰن' جو برطانیہ میں تشدد کی تبلیغ کرتا تھا' سیکولر قوتوں پر پابندی لگانے اور قلمرو کے حصول کے لئے خمینی کی طرح اپنی سرزمین کو لوٹتا"

کر دیا۔

مصر کی نفسیات اور سیاست میں یہ کشیدگی جاری رہے گی۔ اس میں سادات کی دنیا ہے' جو محرکات اور جدیدیت کے امکانات سے پر ہے۔ اور استنبولی کی دنیا ہے' جس میں مغرب کو ایک فاصلے پر رکھنے کا بھرپور اور زوردار عزم ہے۔ اب مصر کے روایتی قانع اور قابل اعتماد متوسط طبقے میں شگاف پڑ چکا ہے۔ اس طبقے کا ایک حصہ نظریاتی سیاست میں جا چکا ہے۔ جبکہ باقی ماندہ غیر جانبداری اور حوصلہ شکنی کا شکار ہو چکا ہے۔ اس لیے کا حل ابھی تک نظر میں نہیں ہے۔

لیکن ہم مصر کی حقیقت اور اس کی بیماری کی نوعیت کو غلط طور پر پیش کریں گے' اگر ہم حکومت اور اسے چیلنج کرنے والے اسلامسٹوں کے درمیان لڑائی پر اتنی توجہ مرکوز کریں اور خیال کریں کہ ایک اور سلطنت بس اب گرنے ہی والی ہے۔ تباہی کی تمام

> "ملک میں تعلیم کی صورتحال بحران سے دوچار ہے۔ کلاس روم تعلیم گاہوں کی بجائے بچوں کو چند گھنٹوں کے لئے ٹھونسنے کے گودام ہیں۔ ان اداروں میں آرٹس اور لٹریچر بمشکل ہی پڑھایا جاتا ہے۔ ان اداروں کو ایسی جگہوں کی بجائے جہاں ثقافتی بیداری اور قدر دانی کی پرورش کی جائے' بطور فوجی بیرکوں کے استعمال میں لایا جاتا ہے"

تر پیشین گوئیوں اور مصری ریاست کی موت کی اطلاعات کے باوجود سیاسی اقتدار کے محافظ کئی طوفانوں سے بچ نکلنے میں کامیاب رہے ہیں۔ یہ سیاسی استحکام کے غیر معمولی ریکارڈ کا حامل ملک ہے۔ گزشتہ دو صدیوں میں جدید مصر پر صرف دو حکمرانوں نے حکومت کی ہے۔ البانیہ میں پیدا ہونے والے قسمت کے دھنی محمد علی' جو ۱۷۹۸ء میں نپولین بوناپارٹ کے حملے کے نتیجے میں پھیلنے والی افراتفری کے بعد سامنے آئے اور ناصر' سادات اور ان کے جانشینوں کی آزاد فوجیوں کی حکومت۔ مصر کے مصائب کے اسباب کچھ اور ہیں۔ عوامی زندگی میں مسلسل کمی' مطلق العنان حکومت کی نااہلی اور متوسط طبقے کے ساتھ اس کے تعلق میں کمزوری ہے' جس کے ذریعے وہ ملک کو غیر ملکی انحصار سے نجات دلا سکتی تھی۔ اس کے علاوہ حکومت غریب طبقات میں ہنر منتقل کرنے میں بھی ناکام رہی ہے' جو قوم میں اقتصادی مسابقت کے لئے ضروری ہے۔ اس کے بغیر ملک کو غلط شان و شوکت اور اپنے پر رحم کھانے کے درمیان سفر سے نکالا نہیں جا سکتا۔

نظریاتی چیلنج

ہمیں نظریاتی چیلنج یا متوسط طبقے کے انحراف کے حجم کو مبالغہ آمیز خیال نہیں کرنا چاہئے۔ ایرانی انقلاب کے جائزے میں' جب مسلح امام نے سیرز کو اقتدار سے نکال باہر مارا' ہم نے ہر جگہ اس کے موضوعات اور نتائج کو ان معاشروں میں تلاش کیا' جو بہت مختلف روایات اور مزاجوں کے حامل تھے۔ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا کہ مصر کا نابینا مبلغ شیخ عمر عبدالرحمٰن' جو بروکلین میں تشدد کی تبلیغ کرتا تھا' سیکولر قوتوں پر پابندی لگانے اور قلمرو کے حصول کے لئے ٹیکنی کی طرح اپنی سرزمین کو لوٹتا۔ حتیٰ کہ وہ لوگ جنہوں نے سادات کو ختم کیا' انہیں ریاست کے مقابلے میں اپنی قوت کے بارے میں کوئی خوش فہمی نہ تھی۔ وہ ریاست کی قوت سے بخوبی آگاہ تھے' جس کے خلاف وہ اپنی پوری قوت صرف کر رہے تھے۔ ان کے پیش نظر صرف "ظالم" کو سزا دینا تھا۔ انہوں نے حسنی مبارک' جو محض چند انچ سادات سے دور کھڑے تھے' سمیت ان کے دیگر نائبین سے احتراز کیا۔ قاتلوں کو توقع تھی کہ سادات کے جانشین آنکھوں دیکھے حال کی روشنی میں رواداری سے کام لیں گے۔ وہ آگ سے کھیلنے سے باز رہیں گے اور اس قسم کے تشدد سے' جس کا ارتکاب سادات (اور ان کی بیوی جہان) نے عوام کے ساتھ روا رکھا تھا۔

اسی طرح ہمیں الجزائر کی یورش کو مصر پر منطبق نہیں کرنا چاہئے۔ الجزائر کے تشدد اور جوابی تشدد پر نظر دوڑائیے۔ اسلامی گروپوں کی ان کی نظروں میں فرانس پرستوں' سیکولرسٹوں اور آزاد خواتین کے خلاف مہم اور حکومت کی جوابی انتقامی کارروائیاں اور ترقی پسندی کے تحفظ کے نام پر اس کے مقرر کردہ قاتل جتھوں کی سرگرمیاں ہیں۔ وحشت اور ظلم و تشدد کی یہ سیاست' جو ۱۹۷۰ء کی دہائی میں ارجنٹائن اور چلی سے مشابہت رکھتی ہے' مصر کے مزاج سے مطابقت نہیں رکھتی۔ فرانس مزاجوں اور اب اسلامسٹوں کے درمیان الجزائر میں پائی جانے والی خلیج' جو اس ملک میں تشدد کی جڑ ہے' اس کی مصر کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ آج کے مصر میں حکومت کے خلاف نفرت بہت ہے۔ لیکن اس سے ملک میں سیاسی اور ثقافتی تسلسل مجروح نہیں ہوا۔ مصری اشرافیہ نے اپنی دولت کو ایئر نہیں اڑایا' جیسے کہ گزشتہ ۳۰ دہائیوں میں الجزائری مقتدر طبقے نے اسے اڑایا ہے۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ الجزائری ریاست کی سطحی بنیادوں کے برعکس' ۱۹۶۰ء کی دہائی میں جو مابعد استعماری وجود ابھرا' اس کے نتیجے میں مصر میں مرکزی اقتدار دو ہزار سالہ دور میں پہنچ گیا۔

حالیہ بے چینی کا آغاز ۱۹۹۲ء میں ہوا۔ جب ریاست اور جماعت اسلامیہ' جو سیاسی اسلام کے حامی زیر زمین دھڑوں پر مشتمل ایک ڈھیلی ڈھالی تنظیم ہے' کے درمیان ایک چھوٹی سی لڑائی چھڑ گئی۔ مسلح جتھوں نے ملک کو غیض و غضب اور گڑبڑ کی آماجگاہ بنا دیا۔ تاہم ریاست نے جوابی حملہ کرتے ہوئے شورش پسندوں کے خلاف بمشکل ہی رحم دلی سے کام لیا۔ اس نے ان کے چیلنج کو وسطی اور بالائی مصر کے دور دراز کے غریب علاقوں میں دھکیل دیا۔ اس طرح یہ جنگ قاہرہ اور اسکندریہ کے ترقی یافتہ اور ابلاغ کے چکا چوند حلقے سے باہر نکال دی گئی ہے اور اب یہ کشمکش حکومت اور اسلامسٹوں کے درمیان انتقام اور خاندانوں کی لامحدود سیاست میں تبدیل ہو چکی ہے' جس میں نہ ختم ہونے والی قتل و غارت اور بدلہ لینے کا سلسلہ پایا جاتا ہے۔ غیر ملکی سیاحوں کے خلاف دہشت کی مہم' اہل علم حضرات کو نشانہ بنانا' ۱۹۹۲ء میں ایک جرات مند سیکولر تبصرہ نگار فراغ فواد کا قتل' دو سال بعد نامور اور بزرگ ادیب نجیب محفوظ پر قاتلانہ حملہ ریاست کے حق میں گیا۔ شورش پسندوں کی طرف سے حکومت کے آدمیوں کو بھی نشانہ بنایا گیا۔ ۱۹۹۳ء میں ۶ ماہ کے عرصے میں تین اہم شخصیات یعنی وزیر اطلاعات' وزیر داخلہ اور وزیراعظم پر حملے ہوئے۔

تخریب کاری کی اس بے رحمانہ مہم کے جواب میں حکومت نے کسی رحمدلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ ریاستی انتظامیہ کو ہری جھنڈی دکھائی گئی کہ وہ مسلح اسلامی گروہوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے اور ایسا کرتے ہوئے وہ ان احتیاطوں اور تحفظات کی پرواہ نہ کرے' قانون کا معاشرہ جن کا احترام اور ان کی توقع کرتا ہے۔ گورنر اور پولیس افسر وسطی اور بالائی مصر کو روانہ کئے گئے' جو مذہبی تنازعے کی مرکزی جگہیں ہیں اور جہاں مذہبی

گروہ طاقت کے استعمال کے لئے معروف ہیں۔ وہاں وسیع پیمانے پر تلاشیاں اور گرفتاریاں معمول کی بات ہیں۔ جیسے کہ یہ قاہرہ کے زیادہ غریب اور ریڈیکل علاقوں میں ہے۔ فوجی ٹریبونل' عدالتی کارروائی میں تیز رفتار ہیں۔ سزائے موت کے جن ۷۰ فیصلوں کا اجرا ہوا' ان پر عملدرآمد کیا گیا۔

اسلامسٹوں کی دہشت کے جواب میں سخت گیر پولیس کارروائی کے ساتھ دوسری طرف حکومت کی طرف سے سیکولر سیاست اور کلچر سے واضح پسپائی بھی نظر آتی ہے۔ سماجی اصلاح' جو اس قدیم سرزمین کی تبدیلی اور اسے ساتھ لے کر چلنے کا ایک بڑا آلہ ہے' اس کے ایک بڑے ایجنٹ کے طور پر حکومت سیکولر نظریے کے بعض کٹر مخالفوں کے ساتھ سودے بازی کے چکر میں پڑ چکی ہے۔ حکومت نے واعظین اور سرگرم عمل مذہبی عناصر کو ثقافتی گنجائش دی ہے۔ جبکہ سیاسی دائرہ کار (جیسے حکومت کی پولیس پاور' اس کی دفاع اور خارجی امور پر بالادستی) کو اپنے لئے مختص کرلیا ہے۔

ریاست کے محافظوں نے قانونی اور معتدل اسلامی گروہوں اور مسلح اسلامسٹوں کے درمیان ایک لائن کھینچ رکھی ہے۔ جبکہ وہ موخر الذکر کا تعاقب کرتی ہے' اول الذکر کے ساتھ وہ امن کی پالیسی پر عمل پیرا ہے۔ ایک ایسی حکومت جو اپنے طور پر مذہبی تصدیق نامے اور مذہبی بہروپ کی خواہشمند ہو' وہ ہوا کے رخ پر چلتی ہے۔ پرانی اخوان المسلمون' اب نوجوان تنظیم جماعت اسلامیہ کے مقابلے میں حکومت کو زیادہ قابل قبول ہے۔ اس کے ممبران کو نشریات اور پرنٹ میڈیا میں رسائی فراہم کی گئی ہے۔ اس سے وہ عوامی ثقافت کی پہچان بن گئی ہیں۔

یہ حضرات اشتعال انگیز مواد پھیلانے میں مصروف رہے تاہم وہ لائن کی صحیح جانب رہنے میں بھی محتاط تھے انہوں نے سیاست اور کلچر کی سرکردہ شخصیات کو کافر اور ملحد قرار دیا۔ انہوں نے کاپٹک عیسائیوں کا تعاقب کیا اور اپنے خیالات کو چھپانے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ کاپٹک میں سب سے بہترین فرد ایک اسلامی ریاست میں محفوظ' لیکن وہ ماتحت کمیونٹی کے نچلے درجے کی حیثیت کا مالک ہوگا۔ ان تمام باتوں کی طرف ریاست نے چشم پوشی کئے رکھی۔

اسلامی علوم اور اصول فقہ کے سرکردہ مرکز الازہر یونیورسٹی کو اس وقت جو تحفظ اور اختیارات حاصل ہیں' وہ موجودہ صدی کے دوران اسے کبھی حاصل نہ تھے۔ جبکہ ناصر کے دور میں الازہر یونیورسٹی بطور ادارہ دفاعی پوزیشن میں تھی' جسے جدید بنایا جانا تھا اور اس میں اصلاحات کا نفاذ مطلوب تھا' آج یہ سماجی اور ثقافتی موضوعات پر نہایت اعتماد کے ساتھ اظہار کرتی ہے۔ ملکی ثقافتی زندگی کے وسیع تر پہلو اب الازہر حکام کے سامنے کھلے ہیں۔ دینیات کا نصاب تعلیم میں سرایت کر گیا ہے۔ سال دو سال قبل جب ریاست کو اس کا احساس ہوا اور اس نے اپنے کھوئے ہوئے کچھ مقام کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی' تو پتہ چلا تمام سکول اسلامسٹوں کے قبضے میں جاچکے ہیں۔ ان سکولوں میں مصری جھنڈے اور قومی ترانے پر پابندی لگا دی گئی' جو کہ مذہبی ریڈیکل عناصر کی نظر میں غیر اسلامی ریاست کے نشان تھے۔ ذہین تجزیہ نگار اور مبصر تحسین بشیر کا کہنا تھا کہ حکومت نے جب سیاسی اسلام کی طرف سے طاقت کے حصول کو کنٹرول کرنے کی طرف توجہ دی' تو پتہ چلا کہ اسلامائزیشن نے معاشرے میں جڑیں پکڑلی ہیں۔

سیاسی اسلامسٹوں پر ریاست کی فتح اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوئی۔ ملک اس وقت جابر ریاست اور نظریاتی گروہ کی کشمکش کے درمیان پھنسا ہوا بے بسی کی حالت سے دوچار ہے۔ ریاست کے سخت اقدامات نے اپنا کام کر دکھایا ہے۔ لیکن اس کے نتیجے میں اہل دانش' اہل سیاست اور تاجر طبقے دہشت زدہ ہوکر حکمت عملی کے تحت پسپا ہوچکے ہیں۔ بعض وہ مرد اور عورتیں' جو اسلامسٹوں کے غیض و غضب سے بچنے کے لئے حکومت کی پناہ لئے ہوئے تھیں' حکومت کی طرف سے سزاؤں کے تناسب اور رفتار پر بھونچکا ہو کر رہ گئیں۔ ایک سرکردہ اپوزیشن راہنما نے مجھے کہا کہ "مبارک سزاؤں کا حکم دیتا ہے اور وہ ان پر پشیمان نہیں ہوتا"۔ وہ اس نوبت تک اس لئے پہنچا ہے کہ حکومت کے تھیلے میں اس کے علاوہ کچھ ہے بھی نہیں۔ مصریوں کے لئے یہ کوئی اطمینان کی بات نہیں کہ وہ اس دہشت سے بچے ہوئے ہیں' جو نسبتاً کم خوش قسمت علاقوں جیسے شام' عراق یا سوڈان میں نظر آتی ہے۔ یہ ایک ملک ہے' جہاں وکلاء اور قانون کی حکمرانی نے ابتدا میں جڑیں پکڑیں۔ ایک معاشرہ' جس زرخیز ہڑتالی روایات انجمنی زندگی اور آزاد عدلیہ اور اس کے ورثے پر فخر کرتا ہے' اس میں دہشت نے مبارک کو شاندار عذر فراہم کیا ہے۔ انہیں متوسط طبقے اور ان کی پیشہ ور تنظیموں جیسے وکلاء' انجینئر' اور صحافیوں کی طرف سے پیش کردہ مطالبات اور سیاسی شراکت کے لئے اقدامات سے فرار میں مدد ملی ہے۔ مبارک نے امن و امان کا کام سرانجام دیا ہے اور اس کے لئے انہیں اقتصادی اور سیاسی اصلاحات کے پیچیدہ مسائل کو پرے دھکیلنے میں آسانی ہوئی ہے۔

"فرانس مزاجوں اور اب اسلامسٹوں کے درمیان الجزائر میں پائی جانے والی خلیج' جو اس ملک میں تشدد کی جڑ ہے' اس کی مصری تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ آج کے مصر میں حکومت کے خلاف نفرت بہت ہے۔ لیکن اس سے ملک میں سیاسی اور ثقافتی تسلسل مجروح نہیں ہوا"

ڈھکی چھپی انا کا راستہ

مصری زندگی کا دل ایک خوفناک قسم کی مایوسی کے احساس سے دوچار ہے۔ جدید مصر کا افتخار اس کی کارکردگی سے کہیں زیادہ ہے۔ مایوس کن نتائج ہر جانب دیکھنے کو ملتے ہیں۔ نچلے طبقے کی غربت ہے۔ ایک کمزور سیاسی میدان ہے' جس میں ایک عام افسر سیاسی اختیارات کا حامل ہے اور وہ کسی بھی متوقع مخالف کو ختم کر سکتا ہے۔ ملک مسلمانوں اور کاپٹک کے درمیان فرقہ وارانہ تنازعے میں الجھتا جارہا ہے' جبکہ اس کی ثقافتی اور تعلیمی صورتحال بگڑ رہی ہے۔

۶ کروڑ کے اس ملک میں ہفت روزہ مصور کے حالیہ انکشاف کے مطابق ایک سال میں صرف ۳۷۵ کتابیں شائع ہوتی ہیں۔ اسرائیل کے برعکس جہاں سالانہ ۴ ہزار کتابیں چھپتی ہیں۔ اس تناظر میں مصر میں چھائی ماتمی فضا کو باآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ ملک کا سرکردہ روزنامہ الاہرام جو ۱۸۷۶ء سے جاری ہے اور جو شاندار تاریخ کا حامل رہا ہے' ناقابل مطالعہ ہے۔ اس میں تفتیشی صحافت اور فکر انگیز تجزیوں کا فقدان ہوتا ہے' سوائے سیاسی مقتدرہ قوتوں کے سطحی سیاسی بیانات کے۔ عظیم ناول نگار نجیب محفوظ' جو کہ پرانی حکومت کی پیداوار ہیں (وہ ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے) نے دکھ اور افسوس کے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مصر کی ثقافت بڑی تیزی سے روبہ زوال

ہے"۔ ہمارے ملک میں تعلیم کی صورتحال بحران سے دوچار ہے۔ کلاس روم تعلیم گاہوں کی بجائے بچوں کو چند گھنٹوں کے لئے ٹھونسنے کے گودام ہیں۔ ان اداروں میں آرٹس اور لٹریچر بمشکل ہی پڑھایا جاتا ہے۔ ان اداروں کو ایسی جگہوں کی بجائے جہاں ثقافتی بیداری اور قدر دانی کی پرورش کی جائے' بطور فوجی بیرکوں کے استعمال میں لایا جاتا ہے۔ انکشاف کے سے انداز میں ممبر کریم البردی نے خبردار کیا کہ ملک کو ترقی یافتہ اور جدید بنانے کی مہم کو جس کا آغاز ۱۸۰۰ء کی ابتدائی دہائی میں یورپ سے واسطہ پڑنے پر ہوا' ریورس کیا جارہا ہے۔ (۱۹۲۰ء کی دہائی سے ۱۹۹۵ء کے انقلاب تک)

یہ اس مایوسی کا نتیجہ ہے کہ ناسٹلجیا کی ایک طاقتور لہر مصری سیاست کے لبرل دور میں ابھری ہے۔ اس وقت کی ہنگامہ خیز سیاسی زندگی' اس وقت کا جاندار پریس' اس کا ایلیٹ کلچر اپنے لٹریچر اور آرٹس کے ساتھ' اس کی جرائتمند اور آزاد خواتین' جنہوں نے ملک کی سیاسی' ثقافتی اور صحافتی زندگی میں اپنے لئے جگہ پیدا کی۔ ان میں سے بعض چیزیں اس وقت ایک پرہجوم' بوجھ تلے دبے معاشرے کے گم شدہ معصوم اور شاندار وقت کے حوالے سے ناسٹلجیا کی حیثیت رکھتی ہیں اور وہ عوامی زندگی کی عمومیت پر عدم اطمینان کا جائز اظہار بھی ہیں۔ مصر نے ۱۹۳۰ء کی دہائی میں آج کے مقابلے میں زیادہ بہتر اور آزاد سینما پیدا کئے۔ اس کے سرکردہ دانشور حضرات دیو قامت تھے' جنہوں نے اس وقت کے مسائل کو چن چن کر ختم کیا اور انہوں نے مصری اور عربی ادیبوں کو غیر متنازعہ شان کا لمحہ عطا کیا۔ اسی دور میں ایک کاپٹک نقاد اور ادیب لوئیس عواد جو ایک پرنویس اور آزاد ادیب تھا' ۱۹۱۵ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۹۰ء میں وفات پاگیا۔ اس کے ساتھ ایک دور کا گویا اختتام ہوگیا۔ فوجی دور کے مصر نے عواد اور محفوظ اور ان جیسے افراد کے مرتبہ کی شخصیات پیدا نہیں کیں۔

۱۹۸۱ء میں جب سے حسنی مبارک برسراقتدار آئے ہیں' مصر کی آبادی میں ۱۶ ملین افراد کا اضافہ ہوا ہے۔ یہ اضافی آبادی' اردن' اسرائیل' لبنان اور مغربی کنارے اور غزہ پٹی کی مجموعی آبادی سے زیادہ ہے۔ مصر کی غربت اور ضروریات کے بارے میں حقائق اتنے واضح ہیں کہ کوئی بمشکل ہی اس کے بارے میں بتانا ضروری سمجھتا ہے۔ اعداد و شمار سے مسئلہ کی سنگینی کا پتہ چلتا ہے۔ ہر سال ۴ لاکھ افراد روزگار کی تلاش میں مارکیٹ میں داخل ہوتے ہیں۔ نئے داخل ہونے والوں میں سے ۷۵ فیصد بے روزگار ہوتے ہیں۔ ان میں سے ۹۰ فیصد انٹرمیڈیٹ یا ہائر تعلیمی ڈپلوما رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حسنی مبارک کے ناقدین حکومت کے بوجھ کو تسلیم کرتے ہیں۔ چنانچہ روزگار کی منڈی کو برقرار اور جاری رکھنا گویا سمندر میں ہل چلانے کے مترادف ہے۔ پرہجوم جگہیں بوڑھا طبقے کے دور اور ان کی باغات والی رہائشوں سے کہیں آگے جاچکی ہیں۔

پان عرب ازم سوچ

مصر میں پان عرب کی ہوا اور پان عرب کی ترغیب نئے سرے سے سر اٹھا رہی ہے۔ اصل میں یہ ایک پرانی ڈھارس کی واپسی ہے' جو ماضی میں مصر کے لئے ناکامی اور تلخی کا باعث بنی۔ مصر کے دانشور اور پنڈت ۱۹۶۰ء کی دہائی میں پان عرب ازم کے حق میں جو دلائل تھے' انہیں دوبارہ تازہ کررہے ہیں۔ گزشتہ دو دہائیوں میں امریکہ کی طرف سے مصر کے لئے وسیع پیمانے پر امداد کے باوجود لوگوں میں امریکہ کے بارے میں مخاصمت بڑھ رہی ہے اور ان کے ذہن میں یہ خیال جڑ پکڑ رہا ہے کہ امریکہ مصر کو مستقلاً انحصار اور بے بسی کی صورت میں دیکھنا چاہتا ہے۔ اس ضمن میں لیبیا اور عراق کی مثال پیش کرتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ امریکہ بہرحال اسرائیل کے ساتھ مل کر مصر کی طاقت اور اثر و نفوذ کو ختم کرنے کے درپے ہے۔ اگرچہ اسرائیل کے ساتھ معاہدہ برقرار ہے' لیکن ملک کے پیشہ ور اور دانشور حضرات کی طرف سے اس سے لاتعلقی اور عدم دلچسپی کا رویہ ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ پان عرب ازم کا نیا ورژن قابل عمل ہوگا۔ جبکہ ناصر کی زیر قیادت اس کا پرانا ورژن رومانوی' بڑبولا اور فسادی نوعیت کا تھا۔ اب مصر دوسرے عرب ممالک کی قیادت کرے گا۔ وہ (ایران کے خلاف) خلیج فارس کی مملکتوں کا دفاع کرے گا۔ وہ اسرائیل کے ساتھ اپنی شرائط کا تعین کرے گا۔ تاہم وہ اسے کسی شور شرابے اور عرب دنیا میں کسی نئی نظریاتی جنگ چھیڑے بغیر انجام دے گا۔ مصر اپنی مہارت اور وسیع پیمانے پر بیوروکریسی کے ڈھانچے کو اسرائیل کے ساتھ طاقت کے توازن کے لئے استعمال میں لائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ مصری ریاست (اور دانشور طبقہ) جس پان عرب ازم کے احیاء کا متمنی ہے' وہ محض وہمہ ہے۔ عرب سیاست میں مصر کی بالادستی ماضی کا حصہ ہے۔ دوسرے عرب ملکوں نے اپنے لئے الگ سے راستوں کا انتخاب کیا ہے۔ مصر پان عرب ازم کے خیال کا آخری حامی اور اسے ترک کرنے میں سب سے اولین تھا۔ اگر مصر اپنے موجود مسائل سے نکلنے کے لئے مذکورہ خیال کا دوبارہ شکار ہوتا ہے' تو اس کا یہ پھیرا بھی ناکامی سے دوچار ہوگا۔ مصری اپنے ملک کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ان کا اپنے مسائل کو دہرانے کا ایک انداز ہے اور پھر اس بات پر اصرار کا کہ ماضی کا مصر دوبارہ ابھرے گا۔ میرا بھی یہ خیال ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ ملک میں اتنا شعور' علم اور رواداری ہے کہ وہ مذہبی جوش و خروش کی حامل فرمانروائی کی بھینٹ نہیں چڑھ سکتا۔ حریف سچائیاں اور تمام تہذیبیں یہاں مدغم ہیں۔ قاہرہ اور دوسرے شہران سے لاتعلق نہیں ہوسکتے۔ خطرہ کسی اچانک اور طوفانی اتار چڑھاؤ کا نہیں' بلکہ ملک کی غربت کی پنہائیوں میں مسلسل اترنے اور نتیجتاً بے حسی اور مایوسی سے دوچار ہونے کا ہے۔

دو دہائی قبل' ۱۹۷۳ء کی جنگ اکتوبر کے بعد صدر ناصر کے ساتھی اور بااثر صحافی محمد ہیکل نے ہنری کسنجر کو واضح کیا تھا کہ مصر دریائے نیل پر واقع ایک ریاست سے کہیں زیادہ حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ایک خیال اور تاریخی تحریک کا نام ہے۔ چنانچہ یہی کچھ اب یہاں موجود ہے۔ بحیرۂ روم کے علاقے کی اکساہٹ کہ مصر یورپ کا حصہ ہے اور پان عرب ازم کا وہم دونوں زمین سے جاملے ہیں۔ آج مصر پر حکمرانی گویا نیل کے ساحل پر واقع ایک بوجھل مملکت پر حکمرانی ہے۔ جس میں ماضی کی عظیم تسلیاں اور فرار کا وجود نہیں ہے۔OO

Fouad Ajami, "The Sorrows of Egypt", Foreign Affairs, 74 : 5 (Septemher - Octtoher 1995), PP.72-8

(بشکریہ : ماہنامہ دینی صحافت)

"اسلامسٹوں کی دہشت کے جواب میں سخت گیر پولیس کارروائی کے ساتھ دوسری طرف حکومت کی طرف سے سیکولر سیاست اور کلچر سے واضح پسپائی بھی نظر آتی ہے"

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے

باسط نے موضوع سے انصاف کیا اور بڑی محنت سے جدیدیت کا پوسٹ مارٹم کیا

"ماڈرن مین" سے مراد یہ نہیں کہ وہ ٹائی لگاتا کوٹ پہنتا اور پائپ پیتا ہے بلکہ...

باسط بلال جیسے نوجوان مسلم معاشرے کا سرمایہ بن سکتے ہیں

۲۴/اپریل ۹۶ء کے روزنامہ جنگ میں شائع ہونے والا مجیب الرحمٰن شامی کا کالم

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام ۱۹ تا ۲۱ اپریل ۹۶ء منعقد ہونے والے سالانہ محاضرات قرآنی میں اس سال مدیر ہفت روزہ زندگی محترم جناب مجیب الرحمٰن شامی صاحب بڑی پابندی سے شریک ہوتے رہے۔ مسلسل تین دن نماز مغرب کے بعد سے نشست کے اختتام تک پوری دلجمعی سے ایک ایسے پروگرام میں شرکت جس میں خشک فلسفیانہ مباحث اور دقیق علمی نکات کی بھرمار ہو' شامی صاحب جیسے نہایت مصروف صحافی کیلئے اگر ناممکن نہیں تو ہماری دانست میں خلاف توقع ضرور تھی۔ ہمارے لئے یہ بات مسرت بخش ہے کہ محترم شامی صاحب نے ان محاضرات میں شرکت ہی نہیں کی' اپنے اخباری کالم "جلسہ عام" میں ان کا ذکر بھی نہایت عمدہ پیرائے میں کیا جس کے ذریعے مرکزی انجمن خدام القرآن کے ان سالانہ محاضرات کا تعارف ایک وسیع حلقے تک ہو گیا۔ تاہم ان محاضرات کے مرکزی مقرر جناب باسط بلال کوشل صاحب کا تعارف شامی صاحب نے جن الفاظ میں فرمایا ہے اس کی کسی قدر وضاحت ضروری ہے۔ شامی صاحب لکھتے ہیں "وہ (یعنی باسط بلال) ڈاکٹر اسرار احمد سے باقاعدہ بیعت یافتہ معلوم ہوتے ہیں"۔ شامی صاحب نے صحیح اندازہ لگایا' باسط بلال بحمد اللہ گزشتہ سال بیعت کر کے تنظیم میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر چکے ہیں۔ اور انہوں نے فی الواقع "ڈاکٹر صاحب کی قرآن اکیڈمی میں ایک طویل چلہ کاٹا ہے" یعنی ایک سالہ رجوع الی القرآن کورس میں باضابطہ داخلہ لے کر انہوں نے گزشتہ سال کورس کے اکثر حصے کی تکمیل کی اور پھر عربی زبان میں مزید مہارت حاصل کرنے اور جرمن زبان کی تحصیل کی غرض سے اسلام آباد تشریف لے گئے۔

محترم شامی صاحب کا یہ جملہ بھی وضاحت طلب بلکہ کسی قدر تصحیح طلب ہے کہ "باسط بلال کو ڈاکٹر صاحب نے اپنی نظریہ پیشکش کے طور پر متعارف کرایا"۔ محترم ڈاکٹر صاحب کو اپنے اس ہونہار شاگرد پر فخر ضرور ہے اور ہونا بھی چاہئے' تاہم یہ امر واقعہ ہے ---- جس کی صراحت خود باسط بلال نے اپنے پہلے دن کے لیکچر کے آغاز میں کر بھی دی تھی ---- کہ محاضرات قرآنی کا یہ پروگرام خود باسط بلال صاحب کی خواہش پر ترتیب دیا گیا تھا۔ انہوں نے قرآن اکیڈمی اور قرآن کالج سے جو کچھ سیکھا تھا اس کے بدل میں وہ اس ادارے کو ان محاضرات کی شکل میں ایک جوابی تحفہ دینے کا آرزو مند تھے۔ اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے ان کی یہ خواہش باحسن وجوہ پوری ہوئی۔ فالحمد للہ علی ذلک۔ ہم محترم شامی صاحب اور روزنامہ "جنگ" کے شکریے کے ساتھ ان کا یہ کالم ہدیہ قارئین کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

جنرل آغا محمد یحییٰ خان اپنے آپ کو تین ٹوپیوں والا صدر کہا کرتے تھے۔ وہ فوج کے سالار تھے' چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے اور صدر پاکستان بھی تھے۔ یہی تین ٹوپیاں جنرل محمد ضیاء الحق کے حصے میں بھی آ گئیں۔ لیکن انہوں نے کبھی چھاتی پر ہاتھ مار کر اپنی ٹوپیوں کا ذکر نہیں کیا۔ عاجزی سے سر جھکا کر خود کو خادم پاکستان ہی کہتے رہے۔ ہمارے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب قبلہ بھی تین ٹوپیوں سے دل بہلا رہے ہیں۔ مرکزی انجمن خدام القرآن کے صدر موسس یعنی بانی صدر ہیں۔ تنظیم اسلامی کے امیر ہیں اور تحریک خلافت کے کماندار ہیں۔ ان تینوں میں ان کی ذات مشترک ہے بہت سے مرید بھی مشترک ہیں۔ کبھی ان کے ہاں تنظیم اسلامی کا اجتماع ہوتا ہے کبھی عالمی خلافت کانفرنس کا اہتمام ہوتا ہے تو کبھی محاضرات قرآنی سے تواضع کی جاتی ہے۔

اس سال انجمن خدام القرآن نے اپنی سالانہ تقریبات کا اہتمام اس طرح کیا کہ ایک پاکستانی نژاد

> **"ڈاکٹر اسرار کی یہ کوشش خوب ہے کہ وہ ایسے "جدید مولوی" تیار کرنے میں لگے ہیں جو دنیاوی علوم سے مرصع ہو کر بھی خود کو زندگی کے قرآنی اسلوب کے سپرد کر دیں"**

امریکی مسلمان نوجوان باسط بلال کوشل کو مدعو کیا۔ وہ پیدا تو پاکستان میں ہوئے تھے لیکن ان کی تعلیم و تربیت امریکہ میں ہوئی ہے اور وہیں سے انہوں نے سیاسیات اور دینیات میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی ہے۔ گزشتہ کچھ عرصے سے پاکستان میں ہیں۔ ڈاکٹر اسرار احمد سے باقاعدہ بیعت یافتہ معلوم ہوتے ہیں کہ ہر گفتگو کا آغاز حمد و صلوٰۃ کے بعد ان کے نام سے کرتے ہیں۔ انہیں اپنا استاد اور راہنما قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی قرآن اکیڈمی میں انہوں نے طویل چلہ کاٹا ہے اور آج کل اسلام آباد میں غالباً عربی زبان کی تحصیل میں مصروف ہیں۔

باسط بلال کو ڈاکٹر صاحب نے اپنی نظریہ پیشکش

کے طور پر متعارف کرایا۔ انہوں نے متواتر تین دن قرآن کالج کے منفرد اور بارعب آڈیٹوریم میں نماز مغرب کے بعد خطاب فرمایا۔ موضوع تھا انسان جدید (ماڈرن مین) پوسٹ ماڈرن ازم کی دہلیز نطشے اور اقبال کے درمیان۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ باسط نے موضوع سے انصاف کیا اور بڑی محنت سے جدیدیت کا پوسٹ مارٹم کیا۔ "پوسٹ ماڈرن ازم" ایک نئی اصطلاح ہے جسے کئی مغربی سماجی ماہرین استعمال کرتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ جدیدیت اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے اور اب "ورائے جدیدیت" سفر کا آغاز کر رہی ہے۔ گویا آسمان کو دین سمجھ کر ایک نئے آسمان کی تلاش کو منزل بنا لیا گیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ "جدیدیت" اپنی موت آپ مر رہی ہے اور اب بعد از جدیدیت دنیا کو نئی زمین کی تلاش ہے جہاں وہ پاؤں ٹکا سکے یعنی جہاں پیر مر رہا ہے اور جہان تازہ ابھر رہا ہے۔

باسط بلال نے پہلے "جدیدیت" اور انسان جدید یا ماڈرن مین کا نقشہ کھینچا کہ ماڈرن مین سے مراد یہ نہیں ہے کہ وہ ٹائی لگاتا، کوٹ پہنتا اور پائپ پیتا ہے جبکہ اس کے مقابل مخلوق دھوتی باندھتی اور حقہ پیتی ہے۔ بلکہ "ماڈرن مین" وہ ہے جو مغربی تہذیب کے تین بنیادی عقائد کی بنیاد پر سانس لیتا ہے۔ سائنٹزم، سیکولرزم اور کیپیٹلزم۔ باسط کا کہنا تھا کہ ان تینوں کی لاشیں اب ہمارے سامنے پڑی ہیں۔ تینوں بنی نوع انسان کی تنہائی اور بے چارگی دور نہیں کر سکے اور اب یہ دور اپنے ابراہیم کی تلاش میں ہے۔ اس کے دور کا مداوا اسلام کے پاس ہے، اسلام کہ جو محض ایک سماجی اور سیاسی ڈھانچے کا نام نہ ہو بلکہ وہ جس میں "طریقت" اور "شریعت" دونوں کو سمو دیا گیا ہو۔ باطن اور ظاہر دونوں پر اس کی گرفت ہو اور وہ انسان کو اندر سے تبدیل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

باسط بلال کے فکری اسلوب اور نتائج سے کئی مقامات پر اختلاف کیا جا سکتا تھا اور ڈاکٹر خالد علوی نے آخری دن اپنے صدارتی خطبے میں شریعت اور طریقت کی تقسیم پر اعتراض بھی کیا۔ وہ شریعت کو صرف فقہ قرار دینے والوں سے متفق نہیں تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے اس پر یہ گرہ لگائی کہ ہمیں الفاظ اور اصطلاحات کی بحث میں الجھ کر مغز کو اوجھل نہیں ہونے دینا چاہیے۔ باسط بلال نے الفاظ جو بھی چنے ہوں، پورے سیاق و سباق میں ان کا مفہوم یہی ہے کہ ظاہر کے ساتھ ساتھ باطن کی طرف بھی توجہ دی جانی چاہیے۔ گویا اسلام محض ایک سیاسی جماعت کا منشور نہیں ہے اس سے اٹھ کر بہت کچھ ہے اور اس بہت کچھ کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا جب تک اسے برتا نہ جائے، یعنی جب تک ایمان حال نہ بن جائے۔

ڈاکٹر اسرار احمد کے برادر خورد اور فلسفے کے نامور استاد ڈاکٹر ابصار احمد نے تینوں دن نظامت کے فرائض ادا کئے۔ نامور دانشور پروفیسر سجاد نصیر تنظیم اسلامی امریکہ کے صدر جناب عطاء الرحمٰن اور اسلامی علوم کے ممتاز استاد ڈاکٹر خالد علوی نے ایک ایک دن صدارت کے فرائض ادا کئے۔ عطاء الرحمٰن زیڈ اے سلہری صاحب کے قائم مقام تھے کہ وہ ناسازی طبع کی بناء پر طویل نشست کے متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ پروفیسر سجاد نصیر نے بنیادی سوال اٹھایا کہ مغربی تہذیب پر جو بھی اعتراض کیا جائے اور اس جس طرح بھی رد کیا جائے، یہ ایک حقیقت ہے کہ اسے غلبہ حاصل ہے اور گزشتہ دو سو سال سے اس کی پیش قدمی مسلم ہے۔ آگے بڑھنے کی جو صلاحیت اس تہذیب کے پاس ہے، اس پر بھی غور کیا جانا چاہیے۔ ڈاکٹر خالد علوی نے اپنا نکتہ ایک اور رنگ میں اٹھایا۔ ان کا کہنا تھا کہ اسلام کی برتری مسلم ہے اور ہمارے عقیدے کا حصہ ہے لیکن اس کے نفاذ کا مرحلہ سر کیسے کیا جائے؟ وہ کون سا طرز عمل اختیار کیا جائے کہ ہمارا ماڈل ہمارے لفظوں سے اتر کر زمین پر آ جائے۔

اس سوال کا جواب ظاہر ہے کہ ابھی تک دیا نہیں جا سکا۔ ڈاکٹر اسرار احمد یا باسط بلال، سب اس کی تلاش میں ہیں۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ باسط بلال جیسے نوجوان مسلمان معاشرے کا سرمایہ بن سکتے ہیں۔ اسے اسلام کی طرف متوجہ کرنے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ سعدی کی گلستان، بوستان رٹنے والے اب لوگوں کو اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتے، اب تو مغرب سے حوالہ لانے والے اور مغرب کے محاورے میں بات کرنے والے ہی مشرق پر مغرب کی یلغار کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ جس طرح ایٹم بم کا مقابلہ ایٹم سے، توپ کا مقابلہ توپ سے، جہاز کا جہاز سے اور ٹینک کا ٹینک سے ہوتا ہے۔ اسی طرح دلیل کا مقابلہ دلیل ہی سے کیا جا سکتا ہے۔ دلیل وہی لائے گا جس کے پاس علم ہو گا۔ جو حضرات بھائی پھیرو اور پتوکی کو مطمئن نہیں کر سکتے، نیویارک اور لندن تو ان کے قابو میں آنے سے رہے۔

ڈاکٹر اسرار کی یہ کاوش خوب ہے کہ وہ ایسے "جدید مولوی" تیار کرنے میں لگے ہیں جو دنیاوی علوم سے مرصع ہو کر بھی خود کو زندگی کے قرآنی اسلوب کے سپرد کر دیں۔ ڈاکٹر صاحب کو پیروکاروں کا بحر بیکراں خواہ میسر نہ ہو سکے لیکن اعلیٰ تعلیم یافتہ افراد کا ایک گروہ ضرور فراہم ہو رہا ہے۔ یہ وہ کامیابی ہے جس کے سامنے فلک شگاف نعرے ہیچ ہیں کہ اس بیج میں تناور درخت بننے کی صلاحیت موجود ہے۔

باسط بلال نے اپنا سفر استقامت سے جاری رکھا تو وہ وقت دور نہیں جب ان کا شمار عالم اسلام کے نامور افراد میں ہو گا۔ ان کی "بلالی اذان" دور دور سنی جائے گی۔

☆☆☆☆☆

TO CHRISTIANS WITH LOVE

Based on the lectures delivered by
Dr. Israr Ahmad

Price Rs. 8.00

Markazi Anjuman Khuddam-ul-Qur'an, Lahore

عورتوں کی حکمرانی نے ملک کا خانہ خراب کر دیا

ہڑتالوں نے بنگلہ دیش کا بھرکس نکال دیا ہے

لوگ مایوسی کے عالم میں آسمان کی جانب دیکھنے لگتے ہیں

تحریر : ٹونی کلفٹن

ہڑتالوں سے کاروبار کو تباہ کر کے انہیں کیا حاصل ہوتا ہے؟

سلمان ایف رحمان یہ بتانے کی کوشش کر رہے تھے کہ ان کی لیڈروں کی آپس کی رقابتوں کی وجہ سے ملک کا کیا حال ہو چکا ہے اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی ان مشکلات اور مصائب کے بارے میں سوچنے پر راضی نہیں جو ان کی وجہ سے عوام کو درپیش ہیں۔ رحمان کا شمار ملک کے امیر ترین صنعت کاروں میں ہوتا ہے اور وہ ان دونوں' وزیر اعظم بیگم خالدہ ضیاء اور حزب اختلاف کی قائد' شیخ حسینہ واجد سے مل چکے ہیں۔ "سب سے پہلے میں خالدہ ضیاء کے پاس گیا اور بتایا کہ ہڑتالوں کے باعث ملکی معیشت تباہ ہو کر رہ گئی ہے' لوگ موت کے کنارے پہنچ چکے ہیں اور کارخانے بالکل بند پڑے ہیں تو وہ فرمانے لگیں' مجھے آپ کے ساتھ بالکل اتفاق ہے آپ جائیں اور حسینہ کو یہ ساری باتیں بتائیں"۔ چنانچہ میں حسینہ کے پاس گیا اور ساری رام کہانی اسے سنائی۔ وہ کہنے لگیں "میں آپ سے صد فیصد اتفاق کرتی ہوں' آپ یہ سب کچھ جا کر خالدہ کو بتائیں"۔

اس کے بعد وہ اشاروں ہی اشاروں میں ہاتھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگے کہ وہیں سے کوئی مدد آئی تو آئے گی۔ مجھے ان کی یہ حرکت عجیب سی لگی لیکن بعد میں جہاں بھی جانا ہوا یہی کچھ دیکھا' لوگ مایوسی کے عالم میں آسمان کی جانب دیکھنے لگتے ہیں جیسے یہاں سے کوچ ہونے والا ہو' یہ دونوں عورتیں ملک کو تباہ کرنے پر گویا تل چکی ہیں۔ پچھلے دو سالوں میں ہڑتالوں نے بنگلہ دیش کا بھرکس نکال دیا ہے اور ہڑتال کرنے والے خالدہ ضیاء کی اقتدار سے علیحدگی سے کم کسی شے پر راضی نہیں تھے۔ گزشتہ سنیچر کو بالآخر خاصی ردوکد کے بعد اس نے ہار مان لی ہے اور نوے دن کے اندر نئے انتخابات کرانے کی راہ کھلی ہے ڈھاکہ میں ہزاروں افراد نے سڑکوں پر ناچتے ہوئے "جمہوریت زندہ ہو گئی" کے نعرے لگائے حالانکہ دشمنی ابھی ختم نہیں ہوئی اور آئندہ کئی سال بنگلہ دیش پر بھاری گزریں گے' گزشتہ ہفتے تک یہ حال تھا کہ سرکاری اہلکار بھی وزیر اعظم کو گالیاں دینے لگے تھے۔

> "بادل' جو آزادی کے لئے جنگ لڑنے والوں کا ساتھی تھا' آج بنگلہ دیش میں اپنے بچوں کے مستقبل سے مایوس ہو چکا ہے' وہ بتا رہا تھا کہ ایسے ملک کے لئے اس نے جنگ نہیں لڑی تھی' نہ ہمارے ساتھیوں نے ان کم بختوں کے لئے جانیں دی تھیں"

میں نے بنگلہ دیش کو وجود میں آتے دیکھا ہے ریس کورس میں دسمبر ۱۹۷۱ء میں اس وقت جلدی سے لگائی گئی چکا چوند کر دینے والی روشنیاں یاد ہیں جب پاکستانی فوج کے کمانڈر جنرل اے۔ اے۔ کے نیازی (ٹائیگر) نے بھاری فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ بستر کی چادروں کو رنگ کر تیار کیا گیا سبز اور سرخ رنگ کا وہ جھنڈا آج بھی میرے پاس ہے جو اس روز زبردستی میرے ہاتھوں میں تھما دیا گیا تھا' رفتہ رفتہ لوگوں کی آنکھیں کھلنا شروع ہوئیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن جیسے دسویں نے نئی نئی شروع کی گئی صنعت کو قومی تحویل میں لے کر اس کا گلا ہی گھونٹ دیا۔ میں نے ۱۹۷۵ء کے وسط میں سخت پہرے کے اندر گھرے ہوئے مجیب کو اس کی رہائش گاہ پر بڑبڑاتے ہوئے دیکھا "میرے عوام مجھے چاہتے ہیں' میرے عوام مجھے چاہتے ہیں" چند ماہ بعد اپنے سپاہیوں کے ہاتھوں خاندان کے بیشتر افراد کے ہمراہ ہلاک ہو گئے۔ مجھے ہنری کسنجر کی اس بات سے کبھی اتفاق نہیں رہا کہ بنگلہ دیش دنیا کا ایک بھیک منگا ملک ہے لیکن ۱۹۸۵ء کے ہولناک طوفان نے مجھے مایوسی سے دوچار کر دیا۔

جنوب مشرقی ایشیاء میں ترقی کی لہر آئی تو بنگلہ دیش کو اس سے فائدہ حاصل کرنے کی بڑی اچھی ترکیب سوجھی' بعض مقامی اور بیرونی سرمایہ کاروں نے دیکھا کہ یہاں مزدوری بہت سستی ہے۔ خاص کر عورتیں صرف ۲۵ ڈالر ماہانہ پر بڑی خوشی سے سلائی کا کام کر سکتی ہیں۔ چنانچہ بنگلہ دیش ایشیائی ٹائیگر نہ سہی' بھیک منگا بھی نہ رہا۔ یہ کیفیت دو سال پہلے تک برقرار رہی جب خالدہ اور حسینہ کی لڑائی شروع ہوئی۔

لڑائی ساری ذاتی ہے' دونوں عورتیں طاقتور گھرانوں کی بیٹیاں ہیں اور دونوں کے عزیز قتل کئے گئے ہیں حسینہ مقتول صدر شیخ مجیب الرحمٰن کی بیٹی ہے جسے کہا جاتا ہے کہ اپنے والد کے قتل میں خالدہ کے خاوند پر شک ہے۔ میجر جنرل ضیاء الرحمٰن جو بعد میں صدر بنا خود بھی قتل ہو گیا۔ خالدہ اپنے خاوند کی طرح سرکاری رہائش گاہ میں نقل ہونے کی بجائے فوجی چھاؤنی میں ہی مقیم رہیں اور اپنی جوانی عام شہریوں سے الگ تھلگ رہتے ہوئے فوج کے افسروں کے درمیان رہ کر گزاری۔ اس طرح اسے خصوصی تحفظ اور ایک منفرد ماحول میسر رہا' جبکہ حسینہ نے عوام کے اندر رہتے ہوئے ہڑتالوں کو ذریعہ بنا کر اپنی دشمن کو مات دینے کا حیلہ جاری رکھا۔ خالدہ کا تو اس سے اپنا کچھ نہ بگڑا لیکن ملکی صنعت' کاروبار اور معیشت کا جنازہ نکل گیا۔ بنگلہ دیش میں چاول کی کاشت شروع ہونے والی

ہے لیکن خدشہ یہ ہے کہ ان کی جنگ ملک کو قحط سے نہ دوچار کردے۔ اب تک اس جنگ میں ۲۵۰ آدمی مارے جاچکے ہیں جن میں بعض سیاسی غنڈے بھی تھے جن کا کام ہی یہی ہوتا ہے لیکن زیادہ تر بے گناہ افراد مارے گئے۔

بنگلہ دیش مغربی پاکستان کی سیاسی بالادستی اور استحصال کے خلاف اندوہناک جنگ لڑ کر وجود میں آیا تھا' میں نے اس جنگ کی کثرت سے رپورٹنگ کی تھی' وہ دردناک مناظر آج بھی آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں جب علی الصبح پاکستانی فوج کے ہاتھوں قتل ہونے والے بنگالیوں کی لاشیں سڑکوں پر پڑی نظر آتیں۔ پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کے بعد نئے دور کا آغاز ہوا۔ ہر ایک روشن مستقبل کے خواب دیکھ رہا تھا مگر شاید ہی دنیا میں ایسا کوئی ملک ہوا ہو جہاں اتنی تیزی سے لوگوں کی امیدوں پر پانی پھرا ہو۔ فوجی حکومت اور معاشی بدحالی کے دور میں ڈھاکہ ایک بڑے صوبائی قصبے سے زیادہ نہ تھا' فوجی گاڑیوں کو چھوڑ کر معدودے چند کاریں سڑکوں پر نظر آجاتی تھیں۔ آمد و رفت کا اہم ذریعہ موٹر سے چلنے والے یا پیڈل سائیکل رکشا تھے۔ جب کپڑے کی صنعت کو عروج ملا تو موتی جھیل کے کاروباری علاقے میں کنکریٹ کی بلند و بالا عمارتیں ابھرنا شروع ہوئیں۔ سڑکوں پر کوریا اور جاپان سے درآمد شدہ نئی کاریں دوڑنے لگیں مگر اب پھر وہی ۱۹۷۱ء کا سماں ہے۔ نئی کاروں کی جگہ پرانے سائیکل رکشا آگئے ہیں۔ بڑے بڑے ساہوکار مرسڈیز کی جگہ ان سے دفتر آجا رہے ہیں' ٹرکوں کی جگہ بھی سائیکل رکشاؤں نے لے لی ہے۔

ڈھاکہ جیسے شہر میں پرانے حریف اس مصیبت میں ایک دوسرے سے گلے مل رہے ہیں۔ ایک ایسے شخص سے ملاقات ہوئی جس نے ۱۹۷۱ء میں مجھے بم سے اڑانے کی کوشش کی تھی اسے مجھ سے کوئی دشمنی نہیں تھی سوائے اس کے کہ ان دنوں میں ڈھاکہ کے انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں ٹھہرا ہوا تھا' جہاں اعلیٰ پاکستانی افسران اور صحافی مقیم تھے۔ مکتی باہنی والے وہاں بم دھماکہ کرکے یہ دکھانا چاہتے تھے کہ پاکستانی فوج کسی کو تحفظ فراہم کرنے کے قابل نہیں رہی۔ پہلے انہوں نے اس مقصد کے لئے ہوٹل کے ایک کار کن کو استعمال کرنا چاہا مگر اس نے شراب کے نشے میں دھت ہو کر موقعہ گنوا دیا۔ پھر ایک چھوٹے لڑکے کے ذریعہ قسمت آزمائی کی مگر وہ عین وقت پر فیتے کو آگ دکھانا بھول گیا۔ آخر میں ایک مرمت کا کام کرنے

(باقی صفحہ ۲۱ پر)

چیدہ چیدہ

سوڈان کے انتخابات میں ترابی کی کامیابی

۱۹۸۹ء کی بغاوت کے بعد سے دیگر سیاسی جماعتوں سمیت سرکاری طور پر کالعدم نیشنل اسلامک فرنٹ کے سربراہ ڈاکٹر حسن عبداللہ ترابی سوڈان کے حالیہ انتخابات میں پارلیمنٹ کی نشست حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ ۱۹۸۶ء کے بعد یہ پہلے عام انتخابات تھے' ڈاکٹر حسن ترابی مسلمانوں کی ایک اہم غیر سرکاری تنظیم' پاپولر اسلامک پیپلز کانگریس کے سیکرٹری جنرل بھی ہیں' سوڈان میں صدر عمر البشیر کی موجودہ حکومت میں ان کا یہ پہلا سرکاری عہدہ ہو گا۔ ان انتخابات میں اسلام مائل جماعتوں کے امیدوار بھاری تعداد میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ترکی میں ایک سو دانشوروں کو مقدمات کا سامنا

ترکی میں سو کے لگ بھگ دانشوروں کے خلاف علاقائی ثقافت کو اجاگر کرنے اور آزادانہ سوچ رکھنے کے الزام میں مقدمات قائم کئے گئے ہیں۔ ان کا تعلق ایک ہزار سے زائد ترکی کے ان ادیبوں' صحافیوں اور اہل علم سے ہے جنہوں نے آزادی رائے نام کی اس کتاب پر دستخط کئے تھے جس میں کردوں کے مسئلے پر بحث کی گئی ہے۔

ترکی میں انسانی حقوق اور وہاں نئی قائم ہونے والی انتہائی سیکولر ذہن کی حکومت کے حوالے سے یہ مقدمات بہت بڑی آزمائش ثابت ہوں گے۔ انقرہ سے موصولہ رپورٹ کے مطابق گزشتہ ہفتے ترکی کے بین الاقوامی شہرت کے حامل مصنف یاسر کمال کو کرد مسئلے پر ایک مضمون میں علیحدگی پسندی کو ہوا دینے کے الزام میں سزا سنانے کے بعد یہ مقدمات درج کئے گئے ہیں۔ نئے وزیر اعظم مسعود یلمز انسانی حقوق کی وزارت پہلے ہی ختم کر چکے ہیں۔

ترکی کے صدر کا بے نظیر دورۂ اسرائیل

ترکی کے صدر' سلیمان ڈیمرل نے ۱۱/ مارچ کو اسرائیل کے اپنے پہلے مثالی دورے کا آغاز کر کے یہودی ریاست کی ان کوششوں کو باریاب ہونے کا موقعہ عطا کر دیا ہے جو وہ کسی ایک طاقتور مسلم مملکت کے ساتھ عسکری اور معاشی تعلقات استوار کرنے کے لئے جاری رکھے ہوئے تھی۔

ترکی کے انتخابات میں اسلام پرستوں کی حالیہ کامیابی کے بعد صدر ڈیمرل اسرائیلی راہنماؤں کو اپنی حکومت کے اس عہد کی پاسداری کا یقین دلائیں گے جو اس نے اسرائیل کے ساتھ مضبوط روابط قائم کرنے کے لئے کر رکھا ہے۔ (دی مسلم ورلڈ)

نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن

مصری پولیس نے الیگزنڈریا میں ۱۰ غیر ملکیوں کو جن میں ۶ امریکی بھی شامل ہیں ۲۰/ مارچ کو حراست میں لے لیا۔ ان پر شرانگیز مواد پر مبنی کتابچے لوگوں میں تقسیم کرنے کا الزام تھا۔ کتابچے کا عنوان تھا۔ "وہ پوشیدہ باتیں جنہیں کوئی بھی زبان پر لانے کی جرات نہیں کر سکتا---- نیو ورلڈ آرڈر کی پشت پر کیا مقاصد ہیں اور وہ کس طرح آپ کو اپنی گرفت میں لے رہا ہے"۔ یاد رہے کہ مصری "جمہوریت" امریکی پشت پناہی کی مرہون منت ہے۔ (کرسینٹ انٹرنیشنل)

نیوٹن کا کلیہ خلاء میں صحیح نہیں

روسی سائنس دانوں نے ایسے اوزار تیار کئے ہیں جنہیں اگر صفر کشش ثقل کے مقام پر استعمال کیا جائے تو نیوٹن کے اس کلیہ سے کہ عمل کا انتہائی مخالف سمت میں ردعمل ہوتا ہے---- مطابقت نہیں رکھتے۔

مثال کے طور پر اگر ایک خلانورد' خلائی اسٹیشن پر جہاں کشش ثقل صفر ہوتی ہے' کسی شے پر عام ہتھوڑا مارتا ہے تو اس کے جسم کو لامحالہ دھکا لگے گا۔ اگر نئے تیار کردہ ہتھوڑے سے جس میں چھرے بھرے ہوتے ہیں چوٹ لگائی جائے تو خلانورد کا جسم متاثر نہیں ہو گا۔ زمین پر اس ہتھوڑے سے پورا کیل ایک ہی چوٹ سے اندر چلا جائے گا۔ ہتھوڑے کے علاوہ سائنس دانوں نے خاص قسم کے ڈرل اور قینچیاں بھی ڈیزائن کی ہیں۔ (ریڈیانس ویکلی)

کمیشن میں بڑی طاقت ہے

حکومت پہلے کپاس برآمد کرتی ہے پھر مہنگے داموں میں خریدتی ہے

اس ملک میں غذائی بحران ہی نہیں بلکہ غذائی قحط کا خطرہ ہے

جو اشیاء ہمیں انڈیا سے نسبتاً سستے داموں دستیاب ہیں وہ ضرور لینی چاہئیں

تحریر: چودھری محمد شریف

ہندوستان سے تجارت میں سمجھتا ہوں عوام کو اس کی صحیح صورتحال سے آگاہی نہیں۔ ہندوستان سے تجارت ہماری ضرورت ہے۔ اب آپ اسے کسی حالت میں بھی روک نہیں سکتے اور نہ ہماری گورنمنٹ اسے روک سکتی ہے۔ مثال کے طور پر سبزیات کا بیج یعنی بھنڈی، کریلا اور ٹنڈے وغیرہ کا بیج اگر انڈیا سے نہ آئے تو ہمارے ملک میں ان سبزیات کی کاشت ممکن ہی نہیں۔ سارے پاکستان میں بھنڈی اور کریلے کا اتنا بیج بھی پیدا نہیں ہوتا جو ایک ضلع کی بھی ضرورت پوری کر سکے۔ انکے لئے سارا بیج انڈیا سے ہی آتا ہے تو ہماری ضرورت پوری ہوتی ہے۔ چند سال پہلے کا واقعہ ہے انڈیا میں طاعون کی بیماری پھیل گئی۔ پاکستان نے انڈیا سے تمام درامدات پر پابندی لگا دی۔ ہمارے درآمد کنندگان بھی بڑے ماہر ہیں۔ انہوں نے پابندی شدہ اشیاء کی ایل سی پہلے کویت اور دبئی میں کھلوائی اور وہاں سے پاکستان میں وہی اشیاء درآمد کیں۔ دوسرے ملک کا ایک چکر کھانے سے یہ اشیاء اور مہنگی ہو گئیں۔ غریبوں کی گردن پر اور بوجھ پڑ گیا۔

جو اشیاء ہمیں انڈیا سے نسبتاً سستے داموں دستیاب ہیں وہ اگر ہمیں انڈیا دیتا ہے تو ضرور لینی چاہئیں۔ اگر اس میں انڈیا کا فائدہ ہے تو ہمارا بھی تو فائدہ ہے۔ کیا وہی چیزیں دور دراز کے ممالک سے مہنگے داموں منگوا کر ہمیں کوئی خاص تسکین ہو گی۔ ہاں ایک بات ہے کہ صرف ان ہی اشیاء کی درآمد کی اجازت دی جائے جو ہماری معاشیات کے لئے فائدہ مند ہیں نہ کہ کوئی وزیر صاحب انڈیا کے سیٹھوں سے سازباز کر کے ہماری قائم شدہ انڈسٹری کا بھٹہ بٹھا دے۔ کمیشن میں بڑی طاقت ہے۔ کیونکہ ہمارے وزراء اور افسران کو کوئی دانہ ڈالے تو اتراتے ہیں بہت جلد۔ ایک بھی ایسا واقعہ بعض فیلڈز میں ہماری انڈسٹری کی پچاس سالہ کاوشوں کو خاک میں ملا سکتا ہے۔ یہ بڑی سوچ سمجھ سے کرنے والا معاملہ ہے۔

دراصل اس ملک کی بدقسمتی کہ اس ملک میں وزراء اور سیاسی لیڈر وہ لوگ بنے جو ایئرکنڈیشن کمروں اور کاروں سے باہر نہیں نکلتے، اچھا کھاتے اور پہنتے ہیں۔ کاش کہ کوئی غریب کاہل بھی وزیر ہو جاتا۔ اس ملک میں کوئی سر چھوٹو رام وزیر بن جاتا (قبل از تقسیم ملک سکندر حیات یا چودھری فضل حسین کی یونینسٹ وزارت اعلیٰ کے دور میں پنجاب میں سر چھوٹو رام ایک وزیر مال ہوتا تھا۔ اس وقت غریب کاشتکار بنیوں کے سود در سود کے قرضوں تلے بری طرح دبا ہوا تھا۔ چھوٹو رام نے وزیر بنتے ہی یہ قانون بنوایا کہ کوئی ساہو کار غریب دیہاتیوں سے یہ سودی رقوم وصول نہیں کر سکے گا۔ اس قانون سازی سے اس وقت دیہاتی زندگی میں انقلاب آ گیا تھا۔ چھوٹو رام انبالہ ڈویژن کے ایک غریب جاٹ گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ کھدر پوش، نہایت چھوٹا قد، معمولی خدوخال کا یہ انسان پہاڑ جیسے کام کر گیا۔ لوگ آج تک اسے یاد کرتے ہیں۔

قبل از تقسیم ایک انگریز مصنف نے "انیمل فارم" ایک کتاب لکھی تھی۔ جس کا بعد میں کرشن چندر نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ترجمہ شدہ کتاب کا نام "جانور ستان" تھا اس میں سوروں کا ایک کردار تھا۔ وہ شراب بھی پیتے تھے گدوں پر سوتے تھے اور صوفوں پر بیٹھتے تھے اور کامریڈ قسم کے جانوروں سے بری طرح مشقت لیتے تھے۔ انہیں چارہ بھی نہیں دیتے تھے۔ بوڑھا اور کمزور ہونے پر کامریڈ قسم کے جانوروں کو زندہ، ہڈیوں کے خریداروں کے پاس بیچ دیتے تھے۔ اگر ایسے ہی بے خبر اور لاپرواہ لوگوں کا راج اس ملک پر مسلط رہا تو آئندہ اس ملک میں غذائی بحران ہی نہیں بلکہ غذائی قحط کا خطرہ ہے۔ اگر ہمارے وزراء خوراک اور تجارت کو یہ معلوم نہیں کہ پچھلے سال یوریا کھاد ۲۰۰ فی بوری تھی۔ اب ۳۵۰ روپے فی بوری ہے ڈی اے پی نائٹروجن دو سال میں بالکل دوگنے بھاؤ ہو گئی ہے۔ پوٹاش اور ایس ایس پی کھادیں اول تو ملتی ہی نہیں۔ ملتی ہیں تو پچھلے سال سے دگنے ریٹ پر۔ اس پر مستزاد یہ کہ جب گندم کاشت ہو رہی تھی۔ اس وقت ڈی اے پی اور نائٹرو فاس کھادیں نایاب تھیں اور بلیک میں فروخت ہوتی رہی ہیں۔ یہ کھادیں بوقت بجائی استعمال ہوتی ہیں اور اب جبکہ یوریا کھاد کی گندم کو ضرورت ہے تو یوریا نایاب ہے اور بلیک میں فروخت ہو رہی ہے۔ وزیر خوراک صاحب بیان دے رہے ہیں کہ ہم نے ملک میں وافر مقدار میں کھادوں کا بندوبست کر دیا ہے۔ یہ کس کو بیوقوف بنا رہے ہیں؟ خود کو یا زمینداروں کو۔ کھادوں کی بلیک کی وجہ سے کاشتکار چیخ و چلا رہے ہیں۔ ہماری گورنمنٹ کے کانوں تک جوں تک نہیں رینگتی اور سب اچھا کی رٹ لگائے جا رہے ہیں۔ گورنمنٹ کی اپنی ایجنسی اے ڈی سی کھاد کی بوریوں سے کھاد نکال کر چوری کر لیتی ہے اور کم وزن بوریاں فروخت کر دیتی ہے۔ غریب کاشتکار صبر شکر کر کے وہی کم وزن بوری کھاد لیتا رہا ہے کیونکہ بلیک بازار میں کھلے عام تو ملتی نہیں تھی۔ گورنمنٹ کی اپنی ایجنسیوں نے ملک میں اندھیر مچایا ہوا ہے۔ یوٹیلٹی سٹورز پر تھیلی چینی کم۔ گندم کی بوریوں میں مٹی۔

گزشتہ سال کے دوران کھاد کا ریٹ بڑھا ہے ۳۵ فیصد سے ۵۰ فیصد ٹیوب ویلز کے لئے بجلی کا ریٹ بڑھا ہے ۴۵ فیصد اور گندم کا گورنمنٹ نے ریٹ بڑھایا

(باقی صفحہ ۱۷ پر)

چھاپوں اور محاصروں کا سلسلہ اب ختم کیا جانا چاہئے

مہاجروں کے جائز حقوق تسلیم کئے بغیر کراچی کے مسئلے کا دیرپا حل ممکن نہیں

طویل المیعاد منصوبوں کی بجائے پانی' بجلی جیسے فوری مسائل حل کرنے پر توجہ دی جائے

تحریر : گیاہ ضعیف

ہمیں چاہئے تھا کہ ہم سقوط ڈھاکہ کے اسباب و عوامل کا تجزیہ کرتے اور ایسے اقدامات کرتے جس سے بچے کھچے ملک کو تحفظ ملتا۔ لیکن کراچی میں آج جو صورتحال درپیش ہے وہ ہماری ناعاقبت اندیشوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ پاکستان کا قیام مسلم قومیت کی بنیاد پر عمل میں آیا تھا لیکن بعد کے حالات نے ثابت کر دیا کہ مسلم قومیت نام کی کوئی شے یہاں وجود نہیں رکھتی البتہ لسانی اور علاقائی قومیتیں ضرور موجود ہیں چنانچہ بنگالی قومیت کی بنیاد پر پاکستان تقسیم ہوا جو آنکھوں کو کھولنے کے لئے کافی ہونا چاہئے تھا۔ لیکن اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ بہرحال اس صورتحال نے مہاجر برادری کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اگر وہ ایک قومیت کی حیثیت سے متحد نہ ہوئے تو پاکستان میں ان کے حقوق کا تحفظ ممکن نہ ہو گا۔ اسی احساس نے انہیں مہاجر قومیت کا نعرہ لگانے پر مجبور کیا لیکن بجائے اس کے کہ ان کے جائز حقوق کی حمایت اور تائید کی جاتی انہیں طاقت سے دبانے کا راستہ اختیار کیا گیا جس کے نتیجے میں بظاہر ایسا لگتا ہے کہ مہاجر قوت کو کچل دیا گیا ہے اگرچہ یہ اندیشہ بھی ظاہر کیا جا رہا ہے کہ یہ امن کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ نہ بن جائے۔ حکومت نے ایم کیو ایم کو دبانے کے لئے حقیقی گروپ تشکیل دیا لیکن جب اس سے مسئلہ حل نہ ہوا تو "سرکاری" ایم کیو ایم بنانے کی کوشش کی۔ اس میں بھی ناکامی ہوئی تو پختون جرگہ قائم کرنے کی کوشش کی گئی اور اب سندھ اتحاد نام سے ایک نئی جماعت کو فروغ دیا جا رہا ہے۔ ۲۲/ مارچ کو ان کا جلسہ نشتر پارک میں منعقد ہونا تھا اس کی تشہیر کے لئے جو طریقے استعمال کئے گئے ان سے غمازی ہو رہی تھی کہ ع کوئی معشوق ہے اس پردہ زنگاری میں۔ جب تک افہام و تفہیم کے ذریعے مہاجر برادری کے جائز حقوق تسلیم نہیں ہوں گے کراچی کے مسئلہ کا کوئی دیرپا حل ممکن نہیں ہو گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ ایم کیو ایم مہاجروں کی قومی تحریک بن چکی ہے اور کراچی کا ہر خاندان خواہ وہ ایم کیو ایم میں شامل ہو' اس سے اختلاف رکھتا ہو یا غیر جانبدار ہو' براہ راست نہیں تو بلاواسطہ ضرور ایم کیو ایم سے متعلق ہے۔ اگر آپ آفاق شاہد اور نبی داد خان کے خاندانوں کا جائزہ لیں تو ان کا بھی دور و نزدیک ایم کیو ایم سے ضرور تعلق ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ کراچی کے رہنے والے اس وقت شدید بیزاری کے عالم میں ہیں حکومت' حزب مخالف سبھی سے۔ اس وقت ضرورت ہے کہ ان سے ہمدردی کی جائے لیکن زبانی نہیں ہلکہ عملی۔ جبکہ صورتحال یہ ہے کہ حکومت سے اسے سوائے تباہی و بربادی کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ دینی سیاسی جماعتوں پر اسے بھروسہ نہیں۔ میاں نواز شریف کا ساتھ دینے کا اس لئے سوچتے ہیں کہ وہ اقتدار میں آگیا تو صورتحال میں کچھ تو بہتری ہو گی۔ تاہم موجودہ حکومت اگر مثبت رویہ اختیار کرے تو کوئی وجہ نہیں کہ حالات کو بہتر نہ بنایا جا سکے' اب جبکہ مہاجر قوت کو کچلا جا چکا ہے تو حکومت کو چاہئے کہ ایک جوڈیشل کمیشن قائم کرے جو سنگین نوعیت کے مقدمات میں ملوث افراد کو چھوڑ کر بقیہ ایم کیو ایم کے تمام کارکنان کو عام معافی دے تاکہ وہ روپوشی کی زندگی ترک کر کے اپنے خاندان والوں سے آملیں۔ اس سے حکومت کے خلاف دلوں میں جو کدورت پیدا ہو چکی ہے وہ دور ہو گی۔ جوڈیشل کمیشن ان واقعات کا بھی جائزہ لے جن میں پولیس مقابلے میں ہلاکتیں ہوئی ہیں۔ اس تحقیقات کے نتیجے میں اگر پولیس یا رینجرز کی زیادتی ثابت ہو جائے تو اس کے خلاف کارروائی عمل میں لائی جائے اور مقتول کے وارثین کو خون بہا دلوایا جائے۔ مزید چھاپوں اور محاصروں کا سلسلہ اب فی الفور بند ہونا چاہئے۔

بلدیاتی انتخابات کو فی الحال ملتوی کر کے پیپلز پارٹی کے میونسپل کونسلروں کو موقع دیا جائے کہ وہ اپنے علاقوں کے عوام کی بلا امتیاز خدمت کریں اور اپنے آپ کو ان کے ووٹوں کا اہل ثابت کریں۔ کراچی کے شہریوں کے بنیادی مسائل پانی' بجلی' رہائش اور روزگار کا مسئلہ حل کرنے کو ترجیح دی جائے' بجائے اس کے کہ سارا زور ماس ٹرانزٹ اسکیم' لیاری ایکسپریس وے اور فلائی اوورز جیسے طویل المیعاد پراجیکٹ پر صرف کیا جائے۔ پیپلز پارٹی کے پاس کارکنوں کی فوج موجود ہے ضرورت صرف خلوص و اخلاص کے ساتھ ان کو استعمال کرنے کی ہے۔

بقیہ : کھیت اور کھلیان

ہے ۳ فیصد۔ اگر یہ حقائق گورنمنٹ کے علم میں نہیں ہیں تو اس سے زیادہ بے خبر گورنمنٹ دنیا میں نہ ہو گی اور اگر ان کے علم میں ہے تو اس سے نالائق گورنمنٹ اور کوئی نہ ہو گی۔ ملکی زراعت کو ترقی دینے میں انہیں کوئی دلچسپی نہیں۔ باہر گندم درآمد کرنے میں بڑی پھرتی دکھاتے ہیں۔ اگر کوئی انگریزوں کی طرح نیکر پہن کر گرمیوں میں سر پر سولو ہیٹ رکھ کر فیلڈز میں جا کر گندم زیادہ اگاؤ کی عقل اور دیانتداری سے کوشش کرے تو میں ایک کاشتکار ہونے کے ناتے یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ گندم کی پیداوار ایک سال میں اس ملک میں ڈیڑھ سو گنا ہو سکتی ہے اور دو تین سال میں دگنی ہو سکتی ہے لیکن اگر ان کے دل میں کوئی اور بات ہے تو پھر یوٹیلٹی سٹورز پر لائنوں میں اور اضافہ ہو گا۔

"پاکستان کے لئے اربوں روپے کا ٹریڈ خسارہ شرمناک ہے۔ حیران ہوں حکومت پہلے کپاس برآمد کرتی ہے پھر مہنگے داموں خریدتی ہے۔ میرے خیال میں ایسی ہی پالیسیاں ہوں گی جن کی وجہ سے ہر سال ٹریڈ کے خسارہ میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ازبکستان کے مشیر برائے امور خارجہ پروفیسر ڈاکٹر گوگا ہدایت یوف نے روٹری کلب کے سیمینار کے بعد صحافیوں سے گفتگو کرتے ہوئے یہ بات کہی"۔ اگر گندم درآمد کرنے میں بھی کوئی ایسا ہی مسئلہ ہے تو پھر ہم کیا کر سکتے ہیں۔

آج اشتراکی 'عیسائی' یہودی اور ہندو' سب اسلام کے خلاف متحد ہیں

کریمیا کی ایک ہزار مساجد میں سے ایک بھی باقی نہیں رہی

اسلامی جمہوریہ پاکستان سے ہر سال ۵۰ عیسائیوں کو سرکاری خرچ پر ویٹی کن بھیجا جاتا ہے !!

ہمارا ٹیلی ویژن "ساتھی" اور "ہمدم" جیسے دلفریب ناموں سے نوجوانوں میں بے راہ روی کو فروغ دے رہا ہے

تحریر : منظور احمد

بہبود آبادی کے وزیر جے سالک کی طرف سے تمام عازمین حج کے نام ایک خط لکھا گیا ہے جس میں انہیں اس مقدس فریضے کی ادائیگی پر مبارک باد دیتے ہوئے خواتین کے لئے ایک جوڑا کپڑے بھیجنے کی درخواست کی ہے۔ اس سال ایک لاکھ کے قریب پاکستانی حج کی سعادت حاصل کریں گے۔ اگر بہبود آبادی کے عیسائی وزیر کی اس درخواست پر ہماری بھولی بھالی بہنوں کی طرف سے دوپٹے شلوار قمیض بھیجنے کی روایت چل نکلی تو محکمہ بہبود آبادی کے پاس پچاس ساٹھ ہزار قیمتی جوڑوں کا جمع ہو جانا کوئی بڑی بات نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس قسم کی کوئی درخواست حکومت کی طرف سے عازمین حج کو کرنا ہی تھی تو اس کا سہرا ایک کٹر عیسائی کے سر کیوں باندھا جا رہا ہے۔ وزارت مذہبی امور نے جے سالک کو کس جذبے کے تحت عازمین حج کے پتوں کی فہرستیں فراہم کی ہیں؟

مسلمان حاجیوں سے کپڑے لے کر وہ یقیناً غریب بستیوں میں جا کر انہیں تقسیم کرنے کا پروگرام رکھتے ہوں گے۔ مدد مسلمان حاجیوں نے کی ہو گی اور شکریہ یہ حضرت وصول کریں گے۔

بہبود آبادی کے نام پر ایسی ہی مدد اس صدی کے شروع میں روس کی مسلمان ریاستوں میں پہلے بھی ہو چکی ہے جہاں جہالت اور افلاس دونوں سے فائدہ اٹھا کر لوگوں سے کہا جاتا تھا کہ ہمیں مذہب' تہذیب' رسم و روایات سے کوئی سروکار نہیں صرف غریبوں کی اقتصادی بہبود سے دلچسپی ہے۔ شروع میں عورتوں کے حقوق کا چرچا اسی طرح کیا گیا جس طرح آج کل ٹیلی ویژن کے قریباً ہر ڈرامے میں کیا جاتا ہے۔ ہر عورت کو یہی غلط احساس دلایا جاتا ہے کہ وہی معاشرے میں سب سے مظلوم ہے۔ سارا کام وہ کرتی ہے۔ مرد عیاشی کرتا ہے۔ مرد بے وفا ہے۔ اکثر دوسری عورتوں کے ساتھ معاشقہ رکھتا ہے لہٰذا

> "اپریل ۱۹۹۶ء کے جس روز کراچی سٹیل مل کے چند ہندوؤں کیلئے مندر کا افتتاح ہوا اسی روز نام نہاد سیکولر بھارت کی راجدھانی دہلی کی جامع مسجد میں وضو کیلئے بنائے گئے غسل خانوں کو گرانے کا حکم ہوا"

کیا یہ وہی جے سالک نہیں ہیں جنہوں نے توہین رسالت میں ملوث عیسائیوں کی مذمت سے نہ صرف گریز کیا بلکہ یورپی سفارت خانوں کی مدد سے دوران سماعت مقدمہ مجرموں کو ملک سے باہر بھجوانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ کبھی انہوں نے مسلمانوں کے جذبات کا بھی احساس کیا ہے؟ سلمان رشدی' تسلیمہ نسرین کے معاملے میں انہوں نے کبھی برطانیہ یا سویڈن کے سفارت خانوں سے رابطہ کیا کہ مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے والے لوگوں کو پناہ نہ دیں؟

عورت کو بھی گھر میں بیٹھے نہیں رہنا چاہئے بلکہ گھر اور اسباب پر قبضہ قائم کر کے پوری آزادی حاصل کرنی چاہئے۔ روسی مسلمان ریاستوں میں ایسا ہی سلسلہ چلا تھا جو ۱۹۱۱ء میں شروع ہوا۔ شروع میں عورتوں کی اجرتوں میں اضافہ کیا گیا۔ بچے کی پیدائش پر کپڑے دیئے' عورتوں کی بڑی تعداد ان کے دام فریب میں آ گئی۔ ثقافتی میلوں کے نام پر ہونے والے اجتماعوں سے مردوں عورتوں کے کھلم کھلا ملاپ کو فروغ ملا۔ عورتیں بہبود گھر (جو بعد میں کلب گھر' تماش گاہیں اور عشرت گھر بنے) میں زیادہ وقت گزارنے لگیں۔

آج ہمارا ٹیلی ویژن جیسے مانع حمل اشیاء کو کبھی "ساتھی" اور کبھی "ہمدم" جیسے دلفریب ناموں سے جس تواتر سے مشہوری دے رہا ہے اس سے نوجوان لوگوں میں بے راہ روی کو فروغ مل رہا ہے۔ محکمہ خاندانی منصوبہ بندی' خاندان سے باہر رہ کر بھی جنسی تعلقات کو فروغ دینے میں اسی طرح مدد دے رہا ہے جیسے روس میں ہوا تھا۔

ملک میں جس تیزی سے معاشرے کی بنیاد یعنی خاندان کی جڑوں کو اکھاڑنے کا عمل شروع ہو چکا ہے وہ ہماری اسلامی اقدار سے قطعی ہم آہنگ نہیں ہے۔ ایک انگریزی اخبار میں انٹاریو' کینیڈا سے میریلین سلیٹر نے حال ہی میں لکھا ہے۔

"مجھے ایمنسٹی انٹرنیشنل کی وساطت سے آپ کی طرف سے انسانی حقوق کی حفاظت کے لئے اقدام کے بارے میں پتہ چلا ہے۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ پاکستان نے کنونشن آن دی الیمینیشن آف ڈسکری مینیشن اگینسٹ وومن (CEDAW) پر دستخط کرنے کی حامی بھر لی ہے۔ مجھے بس یہ انتظار ہے کہ پاکستان کب یہ دستخط کرتا ہے۔ مجھے یہ احساس ہے کہ آپ کے ملک کے قوانین کو کنونشن کے مطابق ڈھالنے میں وقت لگے گا۔ مجھے امید ہے کہ آپ اس پر ترجیحی بنیادوں پر کام کر کے لوگوں کو اپنے ہم نوا بنا کر جلد از جلد اس کام کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں گے۔ میرا احساس بہت ہی مخلصانہ ہے اور مجھے بیتابی سے انتظار ہے کہ کب پاکستان کے قوانین بین الاقوامی قوانین کے مطابق ڈھلتے ہیں"۔

خط کے مندرجات اس بات کا کھلم کھلا اظہار ہیں کہ پاکستان کے اسلامی قوانین کو ختم کرنے میں دیر

نہیں ہونی چاہئے۔ گویا پاکستان کے موجودہ اسلامی قوانین انسانی حقوق کی نفی کرتے ہیں۔

ہماری اسلامی اقدار پر حملے کی ایک جھلک اس طرح بھی مل رہی ہے کہ انگریزی اخباروں میں خصوصاً عیسائیوں کی طرف سے خطوط شائع ہو رہے ہیں جن میں اس بات کا ذکر تکرار کے ساتھ آتا ہے کہ ہم عید قربان پر جانوروں کی قربانی نہ کریں۔

اسی قسم کے خیالات پنپتے پنپتے حج پر پابندی کا باعث بنیں گے۔ جواز یہ دیا جائے گا کہ ملک اس زرمبادلہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ ازبکستان میں ۱۹۵۵ء میں وہاں کے سلمان رشدی' شاعر جعفر جولیام کی نظم تاشقند کے اخباروں کی زینت بنی جس کا ترجمہ یہ ہے۔

"دین کے داعی اگر اپنے فروعی اختلافات بھلا کر متحد نہیں ہوں گے تو بہت جلد انہیں ایک ایک کر کے ختم کر دیا جائے گا۔ مدرسے بند ہو جائیں گے"

"روزے رکھنا چھوڑ دو۔ یہ فریضہ محمدؐ نے اس لئے عائد کیا تھا کہ وہ عرب کے صحرا میں بھوک کا شکار تھے۔ محمدؐ کا دین بھوکوں کا دین ہے۔ ترقی یافتہ' شکم سیر اور جوان ازبکی عوام کا نہیں"۔ (نعوذ باللہ)

وہاں حج پر جانے پر پابندی پہلے ہی سے لگ چکی تھی۔ روسی انقلاب سے قبل ۱۹۱۱ء میں سائبیریا' وانگا' اورال' ترکستان' قفقاز اور وسطی ایشیا کے دوسرے اسلامی علاقوں میں ۲۵۰۰۰ ابتدائی اسلامی مکاتب تھے۔ روسی سرکاری اعداد و شمار کے مطابق بھی ان کی کم از کم تعداد ۱۰۰۰۰ تھی۔ ۱۰۸۵ اعلیٰ دینی مدارس تھے۔ صرف بخارا میں ۳۸۰ مدارس تھے جن میں ۴۰۰۰۰ طلبہ زیر تعلیم تھے۔ جس طرح رنجیت سنگھ نے بادشاہی مسجد لاہور کو گھوڑوں کے اصطبل میں بدل دیا تھا اسی طرح ان مدرسوں کو چوپالوں' سرخ گوشوں (RED CORNERS) اور مویشیوں کے احاطوں میں بدل دیا گیا اور جس جگہ کا کوئی متبادل مصرف نظر نہیں آیا اس پر پاگل خانے کا بورڈ آویزاں کر دیا۔ پچیس سال کے اندر اندر اس علاقے میں کوئی مدرسہ نہ رہا۔ بخارا کا قدیم مدرسہ "میر عرب" جو ۱۵۳۵ء میں مکمل ہوا تھا ۱۵۵۴ء میں بند کر دیا گیا۔ ۲۱۰۰۰ مسجدوں میں سے صرف ۱۳۱۲ مسجدیں رہ گئیں۔ ۱۹۳۸ء تک کریمیا کی ایک ہزار مساجد میں سے ایک بھی نہیں بچی رہی۔ آذر بائی جان کی ۱۳ مسجدوں کو شہید کر کے سنیما گھر تعمیر کیا گیا۔ ماسکو کی جامع مسجد کو دوسری جنگ عظیم تک پبلک ہال کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا جہاں رقص کی محفلیں جمتیں اور اسلام کے خلاف لیکچر دیئے جاتے۔ قازان میں جامع ابزیم کے عالیشان مینار کو گرا کر عمارت کو کارخانے میں بدل دیا۔ قانون فوجداری کی دفعہ ۱۲۲ کے تحت بچوں کو اسلامی تعلیم دینے پر سزا' ۱۲۳ کے تحت نماز پڑھنے' ۱۲۶ کے تحت مدرسوں مسجدوں کے لئے چندہ جمع کرنے' ۱۲۵ کے تحت پیدائش پر بچے کے کان میں اذان یا تکبیر کہنا' عقیقہ اور ختنہ کرنا سب خلاف قانون قرار دیئے گئے۔ سور پالنا لازمی قرار دیا گیا تاکہ اسلامی تشخص ہی جاتا رہے۔

یہ اس علاقے کی حالیہ تاریخ ہے جہاں اسلام کا بول بالا تھا۔ جس راستے سے ہمارے آباؤ اجداد آئے اور پورے ہندوستان میں اسلام پھیلایا۔ آج اشتراکی عیسائی' یہودی اور ہندو مل کر اسلامی ملکوں کے خلاف سازشیں کر کے اسلام کی بنیادوں پر حملے کر رہے ہیں۔ اسلام ایک طرف اور کفر کی تمام طاقتیں دوسری طرف اکٹھی ہیں۔ کشمیر' بوسنیا' چیچنیا' فلسطین میں کفر کے اتحاد کی مثالیں ہیں۔ ہر داڑھی والا مسلمان دہشت گرد گردانا جاتا ہے۔ حال ہی تک اسے "بنیاد پرست" کہا جاتا تھا۔ اب اس کی تعریف "اسلامسٹ" ہو گئی ہے۔ جوں جوں ان کی گرفت مضبوط ہو گی توں توں یہ اصطلاح لفظ "مسلمان" کے قریب آ جائے گی۔ اگر ہم نے ہوش نہ سنبھالا تو کل سیدھا سادھا مسلمان ہونا ہی قابل مذمت و تنقید ہو کر رہ جائے گا۔ اپنے آپ کو مسلمان کہلانے والا ہر شخص بالکل اسی طرح دہشت گرد مانا جائے گا جس طرح وسط ایشیا میں آزادی کے متوالوں کی تحریک احرار کو "بسماچی" یعنی رہزن اور لٹیرے کہہ کر مارا جاتا تھا۔

ہماری بردباری کا یہ عالم ہے کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان سے ہم ہر سال ۵۰ عیسائیوں کو سرکاری خرچ پر ویٹی کن بھیجتے ہیں۔ اپریل ۱۹۹۶ء کے جس روز کراچی سٹیل مل کے چند ہندوؤں کے لئے مندر کا افتتاح ہوا اسی روز نام نہاد سیکولر بھارت کی راجدھانی دہلی کی جامع مسجد میں وضو کے لئے بنائے گئے غسل خانوں کو گرانے کا حکم ہوا۔ بابری مسجد کے ساتھ جو حشر ہوا سب کو یاد ہے۔ فرانس میں مسلمان لڑکیوں کو پردہ کے لئے حجاب تک پہننے کی اجازت نہیں ہے۔ برطانیہ کے ۲۰ لاکھ سے زیادہ اور امریکہ میں ۳۰ لاکھ کے قریب مسلمانوں کو قومی سطح پر کوئی علیحدہ نمائندگی نہیں۔ ہم نے اقلیتوں کو دوہری تہری ووٹ دے کر ایک طرف ان کے لئے لازمی سیٹوں کا بندوست کیا ہے تو دوسری طرف مسلمان نمائندوں کو بھی کامیابی کے لئے ان کا دست نگر بنا دیا ہے۔

علماء کرام کے گرد جو حصار کھڑا کیا جا رہا ہے اس کا احساس انہیں ہو چکا ہو گا۔ ہم انہیں یاد دلا دیں کہ ۱۹۲۳ء میں بحر ابیض کی نہر کھودنے کا کام جن قیدیوں سے لیا گیا ان میں سے بیشتر علماء ہی تھے۔ بڑے بڑے علماء کو مروایا گیا یا پھانسی لگا دی گئی۔ باقی جیلوں میں مر کھپ گئے۔ سویت فوجداری قانون کی دفعہ ۵۸ کے تحت علماء' موذنین' خطیبوں' واعظوں اور آئمہ مساجد کے شہری حقوق ختم کر دیئے گئے۔ انہیں غیر عامل طبقہ قرار دے کر ان پر بھاری ٹیکس عائد کر دیئے گئے جن کی ادائیگی ان کی حد استطاعت سے باہر تھی۔ ہمارے ہاں بھی یہ سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ مدرسوں کے حساب کتاب پر شک و شبے کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ مساجد میں لاؤڈ سپیکر کے استعمال پر پابندی ہے۔ فحش گانے اور دوسری مکروہات پر کوئی پکڑ نہیں۔ شوکت خانم ہسپتال میں حالیہ دھماکے پر شوشہ اڑایا گیا کہ وہاں دو داڑھی والے آدمی مشکوک حالت میں دیکھے گئے۔ ایک آدھ اور واقعہ ایسا آئے گا جس میں داڑھی والوں کو مورد الزام ٹھہرایا جائے گا۔ باریش لوگوں کو پولیس والے سڑکوں پر روکیں گے اور آہستہ آہستہ داڑھی رکھنے سے گریز ہونے لگے گا۔ لوگ داڑھیاں منڈوائیں گے تاکہ مشتبہ نہ لگیں۔

کلچرل شو' میلے' پاپ شو' ٹیلی ویژن پر ناچ گانا ایک سیکولر تہذیب کو فروغ دے رہا ہے۔ دین کے داعی اگر اپنے فروعی اختلافات بھلا کر متحد نہیں ہوں گے تو بہت جلد انہیں ایک ایک کر کے ختم کر دیا جائے گا۔ مدرسے بند ہو جائیں گے۔ ان پر تخریب کاری فروغ دینے کے الزام پہلے ہی سے لگنے لگے ہیں۔ مسجدیں مرثیہ خواں ہوں گی کہ نمازی نہ رہے۔ ہمارے قوانین یورپ اور امریکہ سے ہم آہنگ ہوں گے۔ عورتیں مغرب کی طرح آزاد ہو کر ذلیل و خوار ہوں گی۔ ہم جنسی کو قانونی تحفظ ہو گا اور نام کے مسلمان ڈش انٹینا کی مدد سے روس کی نسبت زیادہ تیزی سے اسلام سے دور کر دیئے جائیں گے۔ یہاں وسطی ایشیا سے ایک واقعہ کا بیان کر دینا بھی مناسب ہو گا۔

(باقی صفحہ ۲۲ پر)

ثقافتی اور نظریاتی تحفظ کی باتیں اب قصہ پارینہ بن چکی ہیں

اپنی ثقافت کو ہم پر ٹھونسنا مغرب اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے

میڈیا پر جن لوگوں کا قبضہ ہے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسروں کو صحیح راہنمائی فراہم کریں

تحریر: خالد المعینا

گزشتہ ۲۰ برسوں میں دنیا کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے۔ اس عرصے میں رونما ہونے والی ڈرامائی تبدیلیاں پوری دنیا پر اثر انداز ہو رہی ہیں۔ عرب دنیا اس سے باہر نہیں' بلکہ دوسروں نے تو پھر بھی اس چیلنج کا مقابلہ کرنے اور اس پر قابو پانے کے لئے کوئی تیاری کی ہو گی' عرب دنیا اس سے بھی نابلد ہے۔ میرے پیش نظر بلاوجہ کی تنقید اور تنگ ترشی کو ہوا دینا نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ میڈیا پر جن لوگوں کا قبضہ ہے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ دوسروں کو صحیح راہنمائی فراہم کریں اور ان مسائل کی نشاندہی کریں جو آگے چل کر ہمارے نظریات کی بقاء کے لئے اہم ہو سکتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ میں حیرت انگیز پیش رفت' معلومات کی تیز رفتاری' برقی ڈاک' طفیلی سیارچوں (satellites) کا تجارتی استعمال (جو پیشتر ازیں صرف فوجی مقاصد کے لئے تھے) وغیرہ نے' تمام حدیں پار کر لی ہیں۔ ثقافتی اور نظریاتی سلامتی کا کہیں کوئی تصور باقی نہیں رہا۔ ہر شے' ہر وقت' ہر جگہ آپ کو فراہم ہے' ایک عرب دانشور کے مطابق سنسر نام کی کوئی شے باقی نہیں رہی' مگر سوال یہ ہے کہ ہم نے اپنی ثقافت' رہن سہن' عقائد اور نظریات کے خلاف اس حملے کو روکنے کے لئے کون سی کوشش کی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جب مشرق و مغرب کے مابین محاذ آرائی عروج پر تھی' ایسے آلات موجود تھے جن کے ذریعے بیرونی نشریات روکی جا سکتی تھیں اب ان میں رکاوٹ ڈالنے کی بجائے دنیا خود بدل گئی ہے۔ لوگ دنیا کو ایک عالمگیر گاؤں (global village) کی طرح سمجھتے ہیں جس پر مائیکل جیکسن' میڈونا ثقافت چھائی ہوئی ہے۔ کتابوں اور فلموں کے ذریعے ہر ایک اس ثقافت سے مانوس ہے' لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ ہم اس ثقافت سے "فیضیاب" نہ ہوں' اس لئے کہ سیاسی' معاشی اور عسکری طاقت کے بل پر اپنی ثقافت کو ہم پر ٹھونسنا مغرب اپنا پیدائشی حق سمجھتا ہے۔ ذرائع ابلاغ کے توسط سے اس نے اپنے دن کے نشریاتی پروگراموں اور رسوا کن واقعات کو ہمارے گھروں کے اندر پہنچا دیا ہے۔ او۔ جے سمپسن' لورینا بابٹ' شیرون سٹون وغیرہ کو تو جن سے ہمارا دور کا بھی رشتہ نہیں ہم خوب جانتے ہیں جبکہ مسلمانوں کی اکثریت کا یہ حال ہے کہ ان سے کوئی سے چار صحابہؓ یا نبیؐ کی ازواج مطہرات کے نام معلوم کریں یا جنگ حنین یا القادسیہ میں فرق پوچھیں تو جواب دینا مشکل ہو گا۔ جی ہاں! میں مبالغے سے کام نہیں لے رہا۔ صورتحال اس سے زیادہ مختلف نہیں ہو گی۔

> **"انٹرنیٹ پر "سرکاری" سلسلے کوئی قبول نہیں کرے گا۔ لوگ اسے "پروپیگنڈے" سے تعبیر کرتے ہیں۔ پروپیگنڈے کا دور اب ماضی کا قصہ بن چکا ہے۔ معلومات نجی شعبہ کی ملکیت بن چکی ہیں"**

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے خبر رسانی کے فن نے ترقی کر کے دنیا کو معلومات سے بھر دیا ہے' اس فن کا مہارت سے استعمال اور تیزی کے ساتھ پھیلاؤ جدید دور کا ایک اہم شعبہ بن گیا ہے۔ اس سے بھی آگے اب لاکھوں انسانوں کی زندگیوں میں انٹرنیٹ (Internet) سرایت کر رہا ہے صرف چند سال قبل اس کا نام سننے میں آیا تھا۔ انٹرنیٹ کیا شے ہے؟ یہ کمپیوٹروں کی ایک دوسرے سے گفتگو کا نام ہے۔ دنیا بھر میں لاکھوں کمپیوٹر ایک دوسرے سے معلومات کا تبادلہ کرنے میں لگے ہوئے ہیں یوں سمجھئے کہ ایک دیو قامت انسائیکلوپیڈیا ہاتھ آ گیا ہے جس سے لوگ کسی بھی موضوع پر کوئی بھی معلومات متن' شکل' وڈیو یا آواز کی صورت میں حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ ٹیکنالوجی اس سال متحرک تصویر کشی کے لئے بھی متعارف کروائی گئی تھی۔ یقیناً ایسے گروہ بھی ہوں گے جن کا کام خبروں اور بحث مباحثوں کے ذریعے اپنے افکار و نظریات کو دنیا میں پھیلانا ہے اور ہزاروں افراد اس کام میں مشغول ہیں جو انٹرنیٹ پر کسی بھی موضوع پر اپنی آراء کو بلاک روک ٹوک شائع کر رہے ہیں' یہاں تک کہ کچھ لوگ اپنا الگ ایک گروپ بنا کر خبر رسانی کا کام شروع کر دیتے ہیں۔

اسلام سے متعلق مضامین کی پہلے بھی کوئی کمی نہ تھی' بدقسمتی سے ان کی اکثریت بدنیتی پر مبنی اسلام مخالف تھی۔ نرم انداز میں کہی گئی بعض باتیں بیان کئے دیتا ہوں۔ "سعودی عرب میں سرعام چور کے ہاتھ کاٹنے کی سزا کسی باشعور انسان کی سمجھ میں آنا مشکل ہے۔ اور یہ بھی کہ جدید طرز کے مکان میں رہائش پذیر ایک عرب اپنے خادم کو رہنے کے لئے صرف 1.5x2.5x1.5 میٹر سائز کا کمرہ دے کر اس کی جاسوسی کے لئے ایک سوراخ رکھنا کیوں ضروری خیال کرتا ہے"۔

عزیز قارئین! یہ صرف انٹرنیٹ تک ہی محدود نہیں' یونیورسٹی آف میکسیکو کے امریکی طلباء کے انگلش کورس میں یہ باتیں لازمی طور پر شامل کی گئی ہیں۔ بہرحال گلہ ان لوگوں سے نہیں کہ وہ ہمارے بارے غلط سلط باتیں کیوں پھیلاتے ہیں۔ قصور ہمارا اپنا ہے۔ انٹرنیٹ ٹیکنالوجی عام ہوئی تو دنیا کے لاکھوں افراد نے اس سے استفادہ شروع کیا۔ اس وقت ایسے لوگوں کی تعداد ۴۵ ملین ہے جس میں ہر چھ ماہ بعد ۵۰ فیصد کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے' مگر ہمیں کوئی ہوش ہی نہیں۔ ایک یونیورسٹی پروفیسر کا کہنا تھا کہ اس پر پابندی لگنی چاہئے۔ میں نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ جناب! پابندی لگانے کے لئے عرب ممالک کے تمام

ٹیلیفون بند کرنے ہوں گے اور سارے کمپیوٹر اٹھا کر باہر پھینکنے پڑیں گے' ہماری نگاہیں روشن پہلو کی طرف کیوں نہیں جاتیں' کیوں نہ اس ویو سے روحانی افلاس کے شکار لاکھوں افراد کو اسلام سے روشناس کرانے کا کام لیا جائے۔ وجہ یہ ہے کہ ہم صرف باتیں بنانے میں لگے رہے ہیں اور ہمارے مخالفین کام کر کے دکھاتے ہیں۔ انٹرنیٹ استعمال کرنے والے لاکھوں مسلمان اسلام کے خلاف گمراہ کن پروپیگنڈے سے

"انٹرنیٹ ٹیکنالوجی عام ہوئی تو دنیا کے لاکھوں افراد نے اس سے استفادہ شروع کیا۔ اس وقت ایسے لوگوں کی تعداد ۴۵ ملین ہے جس میں ہر چھ ماہ بعد ۵۰ فیصد کے حساب سے اضافہ ہو رہا ہے"

پریشان ہیں۔ یونیورسٹی آف ٹیکساس اور یونیورسٹی آف اوریگن میں ایسی جگہیں (sites) ہیں جہاں سے معین طور پر یہ کام ہو رہا ہے' تاہم ان جگہوں کو تلاش کرنا دشوار ہے اور تو اور احمدی یا قادیانی جو بھی ہیں وہ یہ کام بڑے اچھے طریقے سے کر رہے ہیں اور اپنے فتووں سے اسلام کا مسخ شدہ تصور پیش کر رہے ہیں۔ جس سے سادہ لوح مسلمان یہ سمجھنے لگے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بھی کوئی نبی آ چکے ہیں۔ انہیں فن ابلاغ پر خاصی دسترس حاصل ہے اور امریکہ اور یورپ میں بہت کام کر رہے ہیں۔ انٹرنیٹ میں کسی کا رجسٹرڈ ٹریڈ مارک نہیں ہے۔ آپ کوئی بھی اپنا نام رکھ سکتے ہیں۔ احمدیوں نے اپنے لئے لفظ "اسلام" اختیار کیا ہے۔ کئی دوسرے گروہ بھی اسلام کے نام کو اپنے مذموم مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے درپے ہیں۔ لیکن پھر وہی بات' انہیں برا بھلا کہنے کی بجائے اپنا جائزہ لیجئے۔

مغرب والوں کی رو سے اسلام پسماندگی کی علامت ہے اور یہ تصور ہمیں دیکھ کر انہوں نے قائم کیا ہے ورنہ اسلام میں دنیا پر چھا جانے کی وہ طاقت آج بھی موجود ہے جو چودہ صدیاں قبل تھی۔

اب آیئے دیکھیں کہ کرنا کیا ہے۔ عرب حکومتیں اپنا الگ سلسلہ شروع کرنے کا سوچ رہی ہیں۔ مجھے صاف گوئی سے کام لینے دیجئے۔ انٹرنیٹ پر "سرکاری" سلسلے کوئی قبول نہیں کرے گا۔ لوگ اسے "پروپیگنڈے" سے تعبیر کرتے ہیں۔ پروپیگنڈے کا دور اب ماضی کا قصہ بن چکا ہے۔ معلومات نجی شعبہ کی ملکیت بن چکی ہیں۔ عرب دنیا میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ معلومات کے اس ذریعے کو اپنا ہی نہیں' اسے کنٹرول بھی کر سکتے ہیں مگر یہ موقعہ زیادہ دیر حاصل نہیں رہے گا۔ سائبر سپیس (cyber space) پر جنگ شروع ہو چکی ہے۔ دنیا میں نشریات کی جتنی بھی صورتیں ہیں ان سب کو انٹرنیٹ کے چیلنج کا سامنا ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی باگ ڈور کس کے ہاتھ میں ہے؟ یہ باگ ڈور انٹرنیٹ استعمال کرنے والے لوگوں پر مشتمل ایک نئی عالمی برادری کے ہاتھ میں ہے جسے حکومتی ذرائع سے کنٹرول کرنا ممکن نہیں۔ چین کی حکومت کوشش کر کے دیکھ چکی ہے' میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا کہ اسلام کو دنیا کے کونے کونے تک پہنچانے کے لئے یہ بہترین ذریعہ ہے بشرطیکہ ہم اپنے خول سے باہر نکل کر صرف اللہ کے دین کے لئے اپنے آپ کو وقف کر سکیں۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا' آج جس چیلنج کا ہمیں سامنا ہے اس کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہے' اپنا ایک سیٹلائٹ اسٹیشن حاصل کرنا اچھی بات ہے لیکن آپ کو اپنی ہی زبان میں اپنے لوگوں کو خطاب کرنا ہے۔ آپ مسلمانوں میں تبلیغ کر رہے ہیں۔

انٹرنیٹ سے دور رہ کر ہم اخلاقی اور مذہبی برائیوں کے خلاف جنگ نہیں لڑ سکتے اور لاکھوں عوام عطائی قسم کے "مبلغوں" کے رحم و کرم پر ہوں گے۔ اس صورتحال کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم نے ایک عرب نیٹ ورک قائم کیا ہے جو مشرق وسطیٰ میں کام کرنے والا انٹرنیٹ پر سب سے بڑا سلسلہ ہے لہٰذا عرب دنیا کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے اس سے استفادہ ناگزیر ہو گا۔ اب یہ ہم پر منحصر ہے کہ عربوں' خصوصاً مسلمان عربوں کے بارے میں دنیا کو صحیح معلومات فراہم کر سکیں۔

انٹرنیٹ پر اچھی قسم کے سلسلے دیکھنے سے پتہ چلا کہ غیر مسلموں نے لوگوں کو دھوکہ دینے کے لئے اللہ' محمد' مسلم' جہاد اور اسلام جیسے نام ہتھیا لئے ہیں۔ ایک سرب نے جہاد کا لفظ رجسٹر کر رکھا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے پیش نظر کیا کام ہے۔ ہم نے مکہ' مدینہ' حج' اللہ اکبر' محمد اور مسلم کے الفاظ رجسٹر کئے ہیں' اس لئے ان الفاظ سے متعلق معلومات کے لئے لامحالہ ہمارے قائم کردہ سلسلے سے رابطہ کیا جائے گا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ بہتر کارکردگی سامنے لائی جائے۔ دنیا روحانی تسکین حاصل کرنے کے لئے دھکے کھا رہی ہے۔ اگر ہم اپنے آپ کو درست طور پر پیش کر سکیں' صاف ستھری اور موزوں زبان میں گفتگو کر سکیں تو دنیا میں اپنا کردار ادا کرنا مشکل نہیں' لیکن منصوبے بنانے میں ہی ہم نے وقت گزار دیا تو کیا حاصل۔ ایک دن ضائع کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہزاروں ایسے الفاظ جن کا ہمارے عقائد سے تعلق ہے غیروں کے لئے طبع آزمائی کا کام دے رہے ہوں گے۔

(عرب نیوز' ۲۶ مارچ ۱۹۹۶ء)

بقیہ: مکتوب ڈھاکہ

والے نے مردانہ غسل خانہ میں بم رکھ کر اسے اڑا دیا۔

بادل' جو آزادی کے لئے جنگ لڑنے والوں کا ساتھی تھا' آج بنگلہ دیش میں اپنے بچوں کے مستقبل سے مایوس ہو چکا ہے' وہ بتا رہا تھا کہ ایسے ملک کے لئے اس نے جنگ نہیں لڑی تھی' نہ ہمارے ساتھیوں نے ان کم بختوں کے لئے جانیں دی تھیں۔ ایسی دو عورتیں ہم پر حکمران بن بیٹھی ہیں جنہیں کسی شے کی پرواہ نہیں' نہ اس ملک کی انہیں پرواہ ہے نہ یہاں کے عوام کی۔ ماہر معاشیات اور بینکار' محمد یونس کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ ان خواتین کا کیا دھرا ہے ورنہ کوئی وجہ نہ تھی کہ ہم اس حال کو پہنچتے۔ نہ کوئی نسل مسئلہ ہے نہ نظریات کی جنگ ہے۔ محض ان کی ہٹ دھرمی نے ہمیں ڈبو دیا۔ ستم ظریفی تو یہ ہے عورتوں کی اس جنگ کی سب سے زیادہ مار بیچاری عورتوں پر ہی پڑی ہے۔ سلے سلائے کپڑوں کی صنعت سے لاکھوں نوجوان عورتوں کو روزگار فراہم تھا۔ ڈھاکہ کے خلیل الرحمٰن چوہدری بتا رہے تھے کہ اس کی فیکٹری میں سینکڑوں عورتیں سلائی کا کام کر رہی تھیں جنہیں اپنے روزگار سے محروم ہونا پڑ رہا ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ ہڑتال کرنے والے آخر کاروبار کی تباہی سے کیا حاصل کرنا چاہتے ہیں اور پھر یہ لوگ بسوں کو کیوں جلاتے ہیں؟ مگر اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں' نہ ہی حسینہ واجد اور خالدہ ضیاء کے پاس اس کا کوئی جواب ہے۔

(دی فرنٹیئر پوسٹ)

بقیہ : حدیث امروز

کہ مسلم لیگ میاں محمد نواز شریف کی محنت اور قربانی سے ایک بار پھر مستحکم ہو گئی ہے۔ انہوں نے انتخابی سیاست میں حصہ لینے والی دینی جماعتوں کو میاں نواز شریف کی مسلم لیگ میں شامل ہو جانے کا مشورہ دیا۔ البتہ میاں نواز شریف سے بھی کہا کہ وہ دوبارہ برسر اقتدار آنے کی صورت میں قرآن و سنت کی بالادستی کا اہتمام کرنے کا وعدہ کریں۔ اور سود کے بارے میں وفاقی شرعی عدالت کے فیصلے کے خلاف دائر کردہ اپیل واپس لینے کا اعلان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے استغفار بھی کریں۔OO

بقیہ : دیدۂ عبرت

"۱۸۔ مارچ ۱۹۲۷ء کو بخارا میں ایک بہت بڑی تقریب ہوئی جس میں برقعوں کا ڈھیر لگا کر برسرعام نذر آتش کر دیا گیا۔ پانچ ہزار کے لگ بھگ مسلمان عورتیں ایسی تھیں جنہوں نے مزاحمت کی اور پردہ ترک کرنے سے انکار کیا۔ ان کے سروں سے برقعے نوچ کر الاؤ میں ڈال دیئے گئے۔ رشتہ داروں کی منت سماجت اور ترغیب سے بالاخر ان عورتوں نے بھی بے پردگی اختیار کر لی۔ جبراً پردہ اتارنے کی یہ مہم روسی عورتوں نے انجام دی۔ یہ عورتیں ہر اس رکاوٹ کو دور کرنے کا تہیہ کر چکی تھیں جو ملاؤں اور مسلمان مردوں نے کھڑی کر رکھی تھیں اور ایشیائی عورتوں کو جدید تہذیب کی راہ پر چلنے سے روک سکتی تھیں۔ ۱۸۔ مارچ کو قومی دن کی حیثیت حاصل ہو گئی اور ہر سال اس رسم کو دہرا کر منایا جانے لگا"۔

بہبود آبادی کا تصور مغرب میں یہی ہے نوبل پرائز کے لئے بی بی کا سفارش یافتہ جے سالک کو یہ محکمہ اسی لئے دلوایا گیا ہے۔ اس پر کام شروع ہے۔ ہم سب کیا کر رہے ہیں؟ کچھ کرنے کے لئے بند آج ہی سے باندھنا شروع کریں تو شاید یہ سیلاب رک جائے۔

(بشکریہ : نوائے وقت)

عمران خان۔ ڈیلی "ٹیلیگراف" کی نگاہ میں

پاکستان میں موجود مغربی سفارت کار اب تک تو عمران خان کو کرکٹ ٹیم کے کپتان کی حیثیت سے جانتے تھے یا پھر ایک کھلنڈرے نوجوان کی حیثیت سے' لیکن اب عمران خان ان کے سامنے ایک سیاست دان کے روپ میں آ رہا ہے۔ عمران کے کینسر ہسپتال میں ۱۴/ اپریل کو ہونے والے بم دھماکے کے اثرات اب بھی فضا میں موجود ہیں' اور مغربی حکومتیں بھی اس کا نوٹس لے رہی ہیں۔ دھماکے میں ۷ افراد ہلاک اور ۳۴ زخمی ہوئے تھے۔ مغربی سفارت کاروں کی دلچسپی اس بات میں ہے کہ عمران خان وزیر اعظم بے نظیر بھٹو کے مقابلے میں سیاسی کامیابی حاصل کرنے کے کس قدر امکانات رکھتے ہیں۔ ایک سینئر سفارت کار نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا عمران خان سیاست کے معاملے میں واقعی سنجیدہ ہے؟ کیا اس کے لئے عوام میں حمایت موجود ہے؟ اور عمران کی بیوی جمائما اپنے شوہر کے سیاسی مستقبل کے لئے مفید ثابت ہو گی یا اس کے برعکس نقصان کا باعث بنے گی؟ اگرچہ پاکستان کے عام شہری بڑی حد تک بم دھماکوں اور فائرنگ کے واقعات کے عادی ہو گئے ہیں' تاہم شوکت خانم میموریل ہسپتال کے ویٹنگ روم میں ہونے والے خوفناک دھماکے کے باعث ان میں عمران کے لئے ہمدردی اور حمایت کی نئی لہر پیدا ہوئی ہے۔

پولیس کا کہنا ہے کہ اس کے پاس مجرموں کا کوئی سراغ نہیں ہے۔ تاہم پولیس کے ایک اعلیٰ افسر نے کہا ہے کہ "بم دھماکہ کرنے والوں کا مقصد واضح طور پر یہی معلوم ہوتا ہے کہ عمران خان کو سیاست سے باز رکھا جائے اور اس کے اور وزیر اعظم کے درمیان خلیج کو مزید بڑھایا جائے"۔ وزیر اعظم نے اس موقع پر اپنی سیاسی چالاکی کا ثبوت دیتے ہوئے عمران سے اپنی پرانی دوری کو ختم کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ فوری طور پر کینسر ہسپتال گئیں اور زخمیوں کی خیریت معلوم کی۔ انہوں نے اعلان کیا کہ حکومت ہسپتال کو پہنچنے والے نقصان کی تلافی کرے گی' اس کے ساتھ وزیر اعظم نے عمران خان کی ٹیلی ویژن پر پابندی ختم کرنے کی اجازت دے دی اور اس کی سیاست میں آمد پر اسے خوش آمدید کہا۔ بے نظیر کے طرز عمل میں اس تبدیلی کی ایک وجہ سر جیمز گولڈ اسمتھ کا مشورہ بھی تھا' لیکن عمران نے کوئی مثبت جواب نہیں دیا۔ چنانچہ بے نظیر کے دورے کے موقع پر عمران نے ان سے ملاقات نہیں کی' البتہ حزب اختلاف کے لیڈر جناب نواز شریف کو دھماکے کی جگہ کا خود معائنہ کرایا۔ حکومت کے حامی اخبارات کا کہنا ہے کہ عمران کا بے نظیر سے نہ ملنا جو خود اس کے ہسپتال آئی تھیں ایک طرح کی ناشکری اور بداخلاقی کا مظاہرہ تھا' البتہ یہ اس امر کا بھی اعلان تھا کہ عمران باقاعدہ سیاست کے اکھاڑے میں قدم رکھ چکا ہے۔ عمران کے حامیوں کا موقف ہے کہ وہ بے نظیر کو ہٹانے میں حزب اختلاف کا ساتھ دے گا' لیکن خود کسی سیاسی پارٹی میں شامل نہیں ہو گا۔ اس کے برعکس' عمران کے قریبی دوست' خاندان کے افراد اور بعض عمر رسیدہ سرپرست --- جن میں آرمی کے جنرل اور اخبارات کے سابق مدیر شامل ہیں۔ عمران خان کی سیاسی اور اصلاحی تحریک کے لئے منشور تیار کرنے میں مصروف ہیں جو وہ اس ماہ کے اواخر میں شروع کرنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب عمران اسلامی بنیاد پرست سیاست دانوں کے زیر اثر تھا' لیکن اب اس کے ملنے والوں میں آزاد خیال' بائیں بازو کے مزدور رہنما اور حکومت سے محروم سیاسی عناصر بھی شامل ہو گئے ہیں۔

عمران کے دوستوں کا کہنا ہے کہ اس کے طرز عمل میں اس تبدیلی کی وجہ اس کے سسر سر جیمز گولڈ اسمتھ کا مشورہ ہے۔ گولڈ اسمتھ کا خیال ہے کہ عمران کے بنیاد پرستوں سے تعلقات کی وجہ سے پاکستان میں اور بیرون ملک بھی لوگ اس سے مغائرت محسوس کرنے لگے تھے۔ اسلام آباد کے مغربی سفارت کاروں کی نظر میں عمران خان کا اصل امتحان عوام کی طرف سے مثبت ردعمل کا حصول ہے۔ پاکستان کے عوام واضح طور پر ان جھگڑالو اور لالچی سیاست دانوں سے تنگ آ چکے ہیں جو مارشل لاء کے خاتمے کے بعد سے ملک پر مسلط رہے ہیں۔

(ڈیلی "ٹیلیگراف" ۲۰ اپریل ۹۶ء)

کہتی ہے تجھ کو خلق خدا غائبانہ کیا

پی۔ سی۔ رائے' انگلینڈ کا ایک چشم کشا خط جو امپیکٹ انٹرنیشنل (لندن) کے اپریل ۱۹۹۶ء کے شمارے میں شائع ہوا

Kashmir, after 48 years

As one who was born in India and interested in the well-being of the people of the subcontinent as a whole, I read your cover story on Kashmir in the March issue with great care. While I agree with you on historical basis for Jammu and Kashmir opting for Pakistan in 1947, I strongly suspect that the historical ground has now been invalidated because of the following developments.

After Pakistan came into being in 1947, there was complete 'ethnic cleansing' of Hindus in the Western part of the country, whereas 80 million Muslims were still living in India, a situation never anticipated by the Muslim leaders who were fighting for Pakistan at the time. The resulting imbalance is unsustainable for long, in a world that is facing a population explosion and dwindling resources, unless these countries can live peacefully.

It can be said that it was Divine Will which led to the formation of Pakistan in 1947, which nobody could stop. Nobody could believe in late 1930s that Pakistan would become a reality. But Pakistan has now lost her *raison d'être* before God because of drug culture, ethnic violence, political conspiracies and so on. The very people - 80 million Indian Muslims who voted for Pakistan, of whom 10 million migrated to Pakistan, have now gone against its very roots.

One can understand the feeling of moral responsibility on part of Pakistan to assist the Kashmiri people in their struggle to decide their future, but her action and declaration will lead to military conflict which will surely lead to nuclear confrontation.

In such a situation India, which has been the part of regional geography for the last 5,000 years or more, will survive, though at the cost of terrible destruction and misery for centuries. Pakistan, on the other hand, as a country of 50 years without any natural boundary but based purely on ideological ground, will disappear totally.

The fate of 120 million Muslims in India will be decided by God alone. And the very purpose of creating an Islamic country on the Indian subcontinent will end in total tragedy.

P.C.Roy
Manchester, England

ایک ایسے شخص کے طور پر جو بھارت میں پیدا ہوا لیکن سارے برعظیم کے لوگوں کی بھلائی میں دلچسپی رکھتا ہے' میں نے کشمیر کے بارے میں آپ کی مارچ کے شمارے کے سرورق کی کہانی کا بغور مطالعہ کیا ہے۔ اگرچہ ۱۹۴۷ء میں جموں و کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے بارے میں تاریخی حقائق پر مجھے آپ سے اتفاق ہے لیکن یہ یقین کرنا خاصا مشکل ہے کہ وہ تاریخی بنیاد اب بھی باقی ہے۔

۱۹۴۷ء میں جب پاکستان قائم ہوا تھا تو اس کے مغربی حصے سے ہندوؤں کا مکمل "صفایا" ہو گیا تھا' لیکن مسلمان ۸ کروڑ کی تعداد میں ہندوستان میں ہی رہ گئے تھے۔ اس وقت پاکستان کی جنگ لڑنے والے مسلمان راہنماؤں کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ یہ صورتحال ہو گی لیکن اس سے جو عدم توازن واقع ہوا ہے کسی ملک کے لئے زیادہ لمبے عرصے تک اسے برداشت کرنا مشکل ہے' دنیا پہلے ہی آبادی میں زبردست اضافے اور وسائل میں کمی کے مسئلے سے دوچار ہے اس لئے امن کی جتنی آج ضرورت ہے پہلے نہ تھی۔

پاکستان کا بننا مشیت ایزدی میں تھا اس لئے اسے کوئی بھی نہ روک سکا ورنہ ۱۹۳۰ء کی دہائی کے اواخر تک پاکستان بننے کے دور دور تک کوئی آثار نہ تھے۔ لیکن کیا یہ بھی مشیت ایزدی میں تھا کہ پاکستان میں منشیات' نسلی تشدد' سیاسی دھاندلیوں جیسی ہر برائی عروج کو جا پہنچے گی --- اللہ کی نظر میں پاکستان اپنے قیام کا جواز کھو چکا ہے اور تو اور وہ ۸ کروڑ ہندوستانی مسلمان جنہوں نے پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا اور ایک کروڑ مسلمان جو ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے تھے اپنی اس غلطی پر پچھتا رہے ہیں۔

مانا کہ آزادی کی جدوجہد میں کشمیری بھائیوں کی مدد کرنا پاکستان کی اخلاقی ذمہ داری بنتی ہے لیکن اس ذمہ داری کو پورا کرنے سے دونوں ملکوں کی فوجوں کا آپس میں ٹکراؤ ہو گا اور بات یقیناً ایٹمی جنگ تک پہنچے گی۔ بھارت جغرافیہ کی رو سے ۵ ہزار سال سے یا اس سے کچھ اوپر اس خطے میں موجود رہا ہے اس میں شک نہیں کہ اتنی بڑی تباہی اور بربادی ہو گی کہ کئی صدیوں تک اس کا ازالہ نہیں ہو سکے گا لیکن بھارت بہرحال نیست و نابود نہیں ہو جائے گا۔ اس کے برعکس پاکستان کی جس کی کل عمر ہی ۵۰ سال بنتی ہے' سوائے نظریئے کے کوئی جڑ بنیاد نہیں' نہ اس کی کوئی قدرتی سرحد موجود ہے۔ اس کا باقی رہ جانا معجزہ ہو گا۔ بھارت میں رہنے والے ۱۲ کروڑ مسلمانوں کا سوائے اللہ کے کوئی آسرا نہیں رہے گا اور سب سے بڑھ کر ہندوستان کی سرزمین پر اسلام کے لئے قائم ہونے والا یہ ملک عبرتناک داستان بن کر رہ جائے گا۔

☆☆☆

WEEKLY "NIDA-E-KHILAFAT" LAHORE
36-K, Model Town Lahore- 54700 Regd:No L. 9184

صلہ شہید

روسیوں کو ان کے مارے جانے کا کوئی غم نہیں ہوا

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ چیچنیا والوں کو داؤد جیسا لیڈر مل سکے گا

ان کے بعد باغی قیادت پھوٹ پڑنے سے متحارب دھڑوں میں تقسیم ہو سکتی ہے

تحریر : Phil Reaves

ہمیشہ سے چاک وچوبند جوہر داؤد اس روز زیتونی سبز رنگ کی فوجی وردی میں ملبوس تھے۔ انہیں اس بات کا شدید احساس تھا کہ موت ہر وقت ان کا پیچھا کر رہی ہے لہٰذا اپنا سفید کفن وہ ساتھ لئے پھرتے تھے۔ روسیوں کی بار بار کی قتل کی کوششوں کے باوجود اب تک وہ زندہ تھے ان کوششوں میں کار بم' گرینڈ اور اس طرح کی دیگر عامیانہ کارروائیاں شامل تھیں۔ چنانچہ ان کا کہنا تھا کہ "جب تک اللہ نہ چاہے' مجھے کوئی مار نہیں سکتا"۔ اس کے باوجود ان کی نیم خود کار رائفل ان کے پاس رکھی تھی' دو مسلح محافظ بڑے احترام سے پاس کھڑے رات گئے ان کی یہ گفتگو سن رہے تھے اور باہر مزید محافظ بھی موجود تھے۔

لگ بھگ ایک ماہ قبل ان کے ساتھ بیٹھے ہمیں یہ بات عجیب لگی کہ روسی جن کے پاس سرد جنگ کے دور کی پوری فنی مہارت موجود ہے ان کا پتہ لگانے میں ناکام رہے ہیں۔ آخر ہم نے بھی تو انہیں ڈھونڈ نکالا تھا' تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ روسی شکاری کتوں کی طرح ان کے تعاقب میں تھے لہٰذا انہوں نے ہر قسم کی احتیاطی تدابیر اختیار کر رکھی تھیں۔

باغیوں کے قصباتی ہیڈ کوارٹر میں کئی گھنٹے انتظار کے بعد ہمیں چاروں طرف سے ایک بند ٹرک میں بٹھا کر کاکسس کے پہاڑوں کے درمیان ایک پر خطر طویل سفر طے کرایا گیا۔ باغات' دریا اور کیچڑ بھرے راستے عبور کر کے ہم باغیوں کے ایک اڈے پر پہنچے جہاں سے یکے بعد دیگرے ہمیں کئی جگہ گھمایا گیا۔

ایک محفوظ مکان کے کار پارک میں دو گرد آلود' صدارتی طرز کی بڑی گاڑیاں کھڑی نظر آئیں جو اس چھوٹی سی جمہوریہ پر جنرل داؤد کی تین سالہ حکومت کی یادگار کے طور پر یہاں موجود تھیں۔ تھوڑے فاصلے پر چیچنیا کے جنوب مغربی دیہات پر روسی بمباری کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جب تاریکی پوری طرح چھا گئی تو جنرل داؤد انٹرویو دینے آئے۔ یہ انٹرویو چار گھنٹے تک جاری رہا اور اس میں مغرب کی بدمعاشیوں سے لے کر یلسن حکومت کے جرائم' بے گناہ شہریوں کو بمباری کا نشانہ بنانے اور آزادی حاصل کرنے کے عزم تک کئی معاملات پر گفتگو ہوئی۔

روسیوں کا ان کے قتل پر اربوں روبل خرچ کرنے کا ذکر کرتے ہوئے وہ کہہ رہے تھے کہ ہم اتنے بھی سادہ لوح نہیں ہیں کہ میرے قتل ہونے سے معاملہ ٹھپ ہو جائے گا بلکہ یہ مسئلہ کئی گنا شدت اختیار کر جائے گا۔ ان کی یہ بات کہاں تک صحیح ہے آئندہ چند ہفتوں میں اس کا اندازہ ہو سکے گا۔

اگرچہ ۵۲ سالہ جنرل کے چیچنیا میں کئی دشمن ہیں لیکن آزادی کی جنگ میں انہیں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ان کے بعد باغی قیادت پھوٹ پڑنے سے متحارب دھڑوں میں تقسیم ہو سکتی ہے جو روسی فوج چاہتی ہے۔ چیچنیا کے "صدارتی" ٹیلی ویژن پر جنرل داؤد کی ہلاکت کا اعلان کرتے ہوئے ایک اعلیٰ کمانڈر' شامل بسائی نے نئے کمانڈر کے لئے ۴۵ سالہ زلم خان ژاندر بیوف کا نام لیا جو جنرل داؤد کے ساتھیوں میں سب سے کم معروف ہیں لیکن جب تک اصل جانشین کا انتخاب عمل میں نہیں آتا یہ ایک عارضی سلسلہ رہے گا۔

بہت سے روسیوں کو اس پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ داؤد مارا گیا ہے اگرچہ یلسن نے اسے "پاگل کتا" کہہ کر اس کے مار دیئے جانے کا اعلان کر رکھا تھا مگر کریملن سے ان کے تعلقات کے بارے میں شکوک و شبہات پائے جاتے تھے۔ انہوں نے یلسن کی امن تجاویز پر مذاکرات کے لئے آمادگی ظاہر کر دی تھی لیکن یہ گرمجوشی اس وقت ماند پڑ گئی جب گزشتہ ہفتے ایک روسی قافلے پر حملہ کر کے باغیوں نے ۵۳ روسی سپاہیوں کو ہلاک کر دیا چنانچہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ تخت گیر روسی جرنیلوں نے انتقام کے طور پر جنرل داؤد کو مار دیا ہو۔ بہرحال حقیقت جو بھی ہو' روسیوں کو ان کے مارے جانے کا کوئی غم نہیں ہوا۔ وہ اس تذلیل کو نہیں بھولے جس کا ۱۹۹۱ء کے اواخر میں روس کے فوجی جھابہ برداروں کو چیچنیا میں سامنا کرنا پڑا تھا۔ اسی طرح گزشتہ جون میں چیچنیا کے جانبازوں نے روس کے اندر گھس کر "بدیانوسک" میں ہزاروں لوگوں کو یرغمال بنا لیا تھا اس پر یلسن کو جو خفت اٹھانی پڑی تھی اس کی تلخی ابھی کم نہیں ہوئی۔ پھر حال ہی میں جنوری میں پڑوس کے داغستان کے ایک گاؤں "پرومسکائی" میں یرغمالی بنانے کی کارروائی ہوئی جسے روسی فوج ۳ دن کی مسلسل بمباری کے باوجود ختم نہ کرا سکی۔

یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ چیچنیا والوں کو داؤد جیسا لیڈر مل سکے گا وہ روسی استبداد کی بھٹی سے گزر کر کندن بنے تھے۔ ان جیسے اپنے مقصد کے لئے دھن کے پکے انسان کم پیدا ہوتے ہیں۔ سات بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹے' داؤد ۱۹۴۴ء میں پیدا ہوئے۔ اسی سال سٹالن نے چیچنیا کے لوگوں کو جانوروں کی طرح ٹرکوں میں بھر کر وسطی ایشیا اور سائبیریا میں دھکیل دیا تھا انہی لوگوں میں نومولود داؤد بھی تھا۔

گزشتہ ماہ اپنے آخری انٹرویو میں ہمارے ساتھ باتیں کرتے ہوئے جنرل داؤد کہہ رہے تھے۔ "آپ میری جگہ ہوتے تو آپ کو روسیوں کی سرشت کا علم ہوتا۔ مجھے موت کا خوف نہیں ہے' موت تو انسان کو تمام مصائب اور آلام سے نجات دلا دیتی ہے' لیکن میرے مرنے سے روسیوں کے گھناؤنے جرائم پر پردہ نہیں پڑ جائے گا"۔

سوموار کو غالباً اپنے جنگی محاذ سے سیٹلائٹ فون پر کریملن میں مصالحت کنندہ سے ان کے مذاکرات ہو رہے تھے کہ ایک روسی راکٹ حملے میں وہ جام شہادت نوش کر گئے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

----The Independent